الرسالہ

Al-Risala

October 1994 Issue 215 Rs. 6

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز



رات کی تاریکی کو ختم کرنے کی سادہ تدبیر
صرف ایک ہے
اور وہ ہے ــــــ آنے والی صبح کا انتظار۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اُردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	30/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	25/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	·
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	60/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-

مطالعۂ سیرت	9/-
ڈائری جلد اول	·
کتاب زندگی	40/-
انوارِ حکمت	·
اقوالِ حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	20/-
عقلیاتِ اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	·
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	8/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-

حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامینِ اسلام	30/-
تعددِ ازواج	3/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	9/-
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
الاسلام یتحدی	85/-

ھندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	·
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	3/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	

English

God Arises	85/-
Muhammad The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	40/-
God-Oriented Life	60/-
Religion and Science	40/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	12/-
The Teachings of Islam	15/-
The Good Life	12/-
The Garden of Paradise	15/-
The Fire of Hell	15/-
Man Know Thyself	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	20/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of the Prophet	--
Islam the Voice of Human Nature	--
Islam the Creator of Modern Age	--

آڈیو کیسٹ

حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

ویڈیو کیسٹ

حقیقتِ روزہ	150/-

AL-RISAL BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel 4611128, Fax 4697333

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اکتوبر ۱۹۹۴، شمارہ ۲۱۵

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax : 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 □ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

دو آیتیں

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ کافروں اور منافقوں کی طرف سے تم کو جو اذیت پہنچتی ہے، اس کو نظر انداز کرو (الاحزاب ۴۸) نبیوں پر ان کے مخاطبین نے تکلیفیں ڈالیں تو نبیوں نے ان سے کہا کہ تم ہم کو جو اذیت دے رہے ہو، اس پر ہم صبر کریں گے۔ (ابراہیم ۱۲)

ایک طرف قرآن میں زیادتیوں کے مقابلہ میں صبر و اعراض کا یہ حکم ہے، دوسری طرف اسی قرآن میں کہا گیا کہ اہل ایمان کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ ظلم کرنے والوں کے ساتھ جنگ کریں (الحج ۳۹) ان لوگوں سے اللہ کے راستہ میں جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں (البقرہ ۱۹۰)

یہ دونوں حکم بظاہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پھر ان میں تطبیق کیا ہے۔ ان میں تطبیق یہ ہے کہ دونوں کا محل الگ الگ ہے۔ پہلا حکم ایک موقع کے لئے ہے اور دوسرا حکم دوسرے موقع کے لئے۔

اصل یہ ہے کہ مسلمان کی حیثیت ایک داعی گروہ کی ہے۔ اور دوسرے تمام لوگ ان کے لئے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان اصل نسبت یہی داعی اور مدعو کی نسبت ہے۔ اس نسبت کا تقاضا ہے کہ داعی اپنے مدعو کی زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کرے۔ اس صبر و اعراض کے بغیر داعی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا قائم نہیں ہو سکتی جو کسی نئے پیغام کو سننے اور اس کی طرف انھیں متوجہ کرنے کے لئے ضروری ہے۔

غیر مسلم قوموں کے مقابلہ میں اہل اسلام کو مستقل طور پر اسی پالیسی پر قائم رہنا ہے۔ انھیں غیر مسلموں کے برے سلوک کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔ دعوت کے مرحلہ میں اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

البتہ جب دعوت کا مرحلہ پورا ہو جائے اور غیر مسلم قوم کی طرف سے جارحانہ کارروائی کا آغاز کر دیا جائے تو اس وقت دفاع کے طور پر جنگ کی جا سکتی ہے۔ قرآن میں جنگ کی آیتیں اسی آخری صورت حال سے تعلق رکھتی ہیں۔

جنگ کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ دعوت کا عمل اپنی آخری حد پر پہنچ چکا ہو۔ تکمیل دعوت سے پہلے جنگ چھیڑنا مسلمان کے لئے جائز نہیں۔

ظلم یا تازیانہ

فلولا اذجاءھم بأسنا تضرعوا ولکن قست قلوبھم وزین لھم الشیطان ما کانوا یعملون (الانعام ۴۳)

پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ وہ گڑگڑائے، بلکہ ان کے دل سخت ہوگئے اور شیطان ان کے عمل کو ان کی نظر میں خوشنما کرکے دکھاتا رہا۔

کسی قوم پر جب مذکورہ نوعیت کی سختی آتی ہے تو وہ خود انسانوں ہی کی طرف سے آتی ہے۔ یعنی ایک انسانی گروہ دوسرے انسانی گروہ کو اپنی زیادتیوں کا نشانہ بناتا ہے۔

اب ایسے واقعات کو دیکھنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے اس کو تعلیم خداوندی کی روشنی میں دیکھنا اور دوسرا ہے اس کو تزیین شیطانی کی روشنی میں دیکھنا۔ تعلیم خداوندی کے اعتبار سے جب اس کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بأس اللہ ہے۔ بظاہر اگرچہ وہ انسانوں کی طرف سے ہے مگر حقیقۃً وہ خدا کی طرف سے ہے۔ وہ خدا کا تازیانہ ہے نہ کہ کسی انسان کا ظلم۔

یہ واقعات کو ربانی نظر سے دیکھنا ہے۔ جب پیش آنے والی سختی کو اس نظر سے دیکھا جائے تو اس کے نتیجہ میں تضرع اور رجوع الی اللہ پیدا ہوگا۔ لوگ خدا کی طرف متوجہ ہوں گے۔ وہ اپنے اعمال کا احتساب کریں گے۔ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کرنے لگیں گے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان واقعات کو تزیین شیطانی کی روشنی میں دیکھا جائے۔ اب یہ ہوگا کہ بظاہر جس طرف سے سختی آرہی ہے اسی کو لوگ سب کچھ سمجھ لیں گے۔ وہ صاحبِ سختی ہی کو سببِ سختی قرار دیدیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی سوچ اور ان کے عمل کا سارا رخ انھیں انسانوں کی طرف ہوجائے گا جن کو وہ بظاہر سختی کرتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔

اب وہ خدا سے تضرع کرنے کے بجائے انسانوں کے خلاف احتجاج کریں گے۔ وہ اپنا احتساب کرنے کے بجائے دوسری قوموں سے لڑنا شروع کردیں گے۔ پہلی صورت میں ان کی آبادیاں دعا، عبادت، تواضع، اصلاح اعمال جیسی چیزوں سے معمور ہوتیں۔ مگر دوسری صورت میں ان کی مجلسیں شکایت، احتجاج، ٹکراؤ، انسانوں سے نفرت جیسی باتوں سے گونجنے لگیں گی۔ وہ اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف تشدد اور جنگ کا بازار گرم کردیں گے۔ پہلی صورت میں اگر وہ خالق سے لپٹتے تو دوسری صورت میں وہ مخلوق سے نبرد آزما ہوکر رہ جائیں گے۔

مہجوریٔ قرآن

اقبال برصغیر ہند کے مسلمانوں کے محبوب ترین شاعر اور رہنما ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک شعر میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم قرآن کو چھوڑنے کے نتیجہ میں ذلیل و خوار ہوئے ہو۔ مگر اپنی نا سمجھی کی وجہ سے تم زمانے کی گردش کا شکوہ کر رہے ہو:

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوہ سنج گردش دوراں شدی

مسلمانوں کے تمام علماء اور دانشور پچھلے تقریباً ستر سال سے اس شعر کو دہرا رہے ہیں۔ کسی ایک شخص کو بھی اس سے اختلاف یا اعتراض نہیں۔ اب غور کیجئے کہ قرآن کو چھوڑنے کا مطلب کیا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ قرآن مسلمانوں کے گھروں میں موجود نہیں۔ یا اس کی طباعت و اشاعت بند کر دی گئی ہے۔ یا اس کی تلاوت کرنے والے دنیا میں نہیں رہے۔ ان پہلوؤں سے آج بھی مسلمان اس کتاب الٰہی کو پکڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ ان پہلوؤں سے قرآن کا رواج اب پہلے سے بھی زیادہ ہے۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسلمانوں نے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے احکام ترک کر دئے ہیں۔ یہ عبادتیں آج دھوم کی حد تک مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ مقامی مسجدوں سے لیکر مکہ اور مدینہ کی مسجد تک ہر جگہ توسیع ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود مسجدیں نمازیوں کے لئے تنگ ہو رہی ہیں۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اسلامی ادارے، اسلامی جماعتیں، اسلامی تحریکیں، اسلامی کانفرنسیں آج کی دنیا میں نہیں ہو رہی ہیں۔ یہ سب کام بھی آج ہمیشہ سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ اسلام پر آج جتنا زیادہ لکھا اور بولا جا رہا ہے اتنا زیادہ چودہ سو سال میں بھی اسلام پر لکھا یا بولا نہیں گیا تھا۔ حتیٰ کہ جہاد و قتال کا عمل بھی تقریباً تین سو سال سے مسلسل جاری ہے۔

پھر قرآن کو چھوڑنے کا مطلب کیا ہے۔ غور کیجئے تو قرآن کی ایک ہی تعلیم ایسی ہے جس کو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے مطلق طور پر چھوڑ رکھا ہے۔ اور وہ صبر کا حکم ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان صبر کے شعور سے اتنا زیادہ بیگانہ ہو چکے ہیں کہ وہ صبر کو بزدلی اور پسپائی کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں تمام عبادات اور احکام سے زیادہ صبر پر زور دیا گیا ہے۔

مسلمانوں نے سارے قرآن کو نہیں چھوڑا۔ انھوں نے قرآن کی صرف ایک تعلیم (صبر) کو چھوڑ دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قرآن کی تمام برکتوں سے محروم ہو گئے (وما یلقاہا الا الذین صبروا)

اسلامی اقدام

ذاتی اصلاح کے بعد اسلام کا مثبت اقدامی عمل صرف ایک ہے، اور وہ دعوت الی اللہ ہے۔ یہی وہ کام ہے جس کو قرآن میں جہاد کہا گیا ہے۔ جہاد سے مراد اصلاً دعوت ہے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا: وجاھدھم بہ جہاداً کبیرا۔ (الفرقان ۵۲)

قتال یا جنگ اسلام میں کوئی مثبت اقدامی عمل نہیں۔ قتال صرف آخری درجہ میں اس وقت کیا جاتا ہے جبکہ دفاع کے تحت اس کی شدید ضرورت پیش آگئی ہو۔ اس ضرورت کو بھی اس نوعیت کا ہونا چاہئے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار اس وقت سرے سے باقی نہ رہے۔

رسول اور اصحاب رسول کی زندگی میں بعض ایسی مثالیں ہیں جب کہ قتال کا عمل اقدام کا ایک عمل معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کی حیثیت صرف استثناء کی ہے۔ اور استثناء کو عمومی حکم نہیں بنایا جاسکتا۔

اس کی ایک مثال غزوۂ بدر کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے خصوصی حکم کے تحت بدر کے مقام پر منکرین مکہ کے خلاف جنگ کی۔ یہ ایک استثنائی فعل تھا جس کا تعلق صرف پیغمبر سے تھا۔ یہ دراصل اتمام حجت کے باوجود نبوت کے انکار پر خدا کی سنت کا اجرا تھا۔ عام پیغمبروں کے لئے اس سنت کا اجراء زمینی یا آسمانی آفت کے ذریعہ ہوا اور پیغمبر آخر الزماں کے منکرین کے لئے اہل ایمان کی تلواروں کے ذریعہ۔

اس کی دوسری مثال فتح مکہ کے لئے رسول اللہ کا اقدام تھا جو عرب کی فتح کا ذریعہ بنا۔ یہ بھی ایک استثنائی واقعہ تھا۔ اس کا تعلق اس خصوصی مصلحت سے تھا کہ مکہ میں دین توحید کے سوا کسی اور دین کو رہنے نہ دیا جائے (لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب) موطا الامام مالک، ۶۴۴

تیسری مثال رومیوں اور ایرانیوں کے خلاف جنگ ہے۔ تاہم یہ بھی ایک استثنائی واقعہ ہے۔ اس کا تعلق اس سے نہیں کہ اسلام کا اقدامی عمل کیا ہے۔ اس کا تعلق اس خصوصی مقصد سے تھا جس کو قرآن میں استیصال فتنہ کہا گیا ہے (الانفال ۳۹) یعنی مذہبی تعذیب کو ختم کر کے مذہبی آزادی کا دور لے آنا۔

عمومی حکم کو وقتی استثناء کی حیثیت دینا جس طرح درست نہیں اس طرح یہ بھی یقینی طور پر درست نہیں کہ ایک حکم کو جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے استثناء ہو اس کو عموم کی حیثیت دے دی جائے۔

داعی اور مدعو

مسلمان کی حیثیت موجودہ دنیا میں کیا ہے۔ قرآن کے مطابق، مسلمان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ دنیا کی قوموں کے اوپر اللہ کے دین کے گواہ ہیں (لتکونوا شہداء علی الناس) اہل اسلام کی حیثیت کے بارہ میں یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ: المؤمنون شُہَدَاءُ اللّٰہِ فِی الارضِ (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۵/۲۹۹) دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ: انتم شہداء اللہ فی الارض (فتح الباری ۳/۲۷۰)

گواہی یا شہادت سے مراد وہی چیز ہے جس کے لئے دوسرے مقام پر دعوت الی اللہ یا تبلیغ ما نزل اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ شہادت کا لفظ اس عمل کے اخروی پہلو کو بتا رہا ہے۔ جو لوگ دنیا میں کسی قوم کے اوپر دعوت و تبلیغ کا کام اس کی تمام شرطوں کے ساتھ انجام دیں گے، ان کو مزید یہ اعزاز حاصل ہوگا کہ قیامت میں جب اس قوم کے ابدی انجام کا فیصلہ ہوگا تو وہاں وہ ان کے سامنے خدائی گواہ کے طور پر کھڑے کئے جائیں گے۔

مسلمان کی اس حیثیت کا تقاضا ہے کہ ان کے اندر داعی والا کردار ہو۔ وہ دوسری قوموں کو مدعو کے روپ میں دیکھیں۔ مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے نہ کہ قومی حریف اور سیاسی رقیب کا رشتہ۔

قومیں آپس میں مادی اور سیاسی مفاد کے لئے رسہ کشی کرتی ہیں۔ مگر مسلمان کے لئے اس قسم کا قومی سلوک کسی بھی حال میں جائز نہیں۔ مسلمان کو اس دنیا میں ایک بامقصد اور ایک صاحب نظریہ گروہ کی حیثیت سے رہنا ہے۔ اس کا مزاج دوسری قوموں سے لینے کا نہیں بلکہ دوسری قوموں کو دینے کا ہونا چاہئے۔ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی شکایتوں اور زیادتیوں کو برداشت کرے۔ وہ تمام لوگوں کے ساتھ یکطرفہ حسن سلوک کا معاملہ کرے۔ اس کی ساری توجہ پیغام رسانی پر ہو نہ کہ حقوق طلبی پر۔ وہ دنیا میں خیر خواہِ اقوام بن کر رہے۔ وہ دنیا کے لوگوں کو مادرِ مہربان کی نظر سے دیکھے۔ وہ اپنے لئے جینے کے بجائے دوسروں کے لئے جینے لگے۔

موافق میدان

اللہ تعالیٰ کی ایک خصوصی مدد یہ ہے کہ اس نے دعوت کے میدان کو ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کا اپنا موافق میدان (ground of one's own choice) بنا دیا ہے۔ کسی اور میدان میں ان کا حریف ان کے اوپر فائق ہو سکتا ہے۔ مگر جب ان کا اور ان کے حریف کا مقابلہ دعوت کے میدان میں ہوگا تو لازمی طور پر وہ اپنے حریف کے اوپر غالب ثابت ہوں گے۔ قرآن اور پیغمبر کی تاریخ کا مطالعہ واضح طور پر اس کو ثابت کر رہا ہے۔

پیغمبر اسلام نے جب قدیم عرب میں اسلام کی دعوت دی تو عرب کے لوگ آپ کے مخالف ہو گئے۔ حتی کہ آپ کے خلاف مسلح لڑائیاں چھیڑ دیں۔ دونوں فریقوں کے درمیان کئی بار ٹکراؤ ہوا، مگر آخری فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔ اس وقت پیغمبر اسلام اور آپ کے مخالفوں کے درمیان وہ معاہدہ پیش آیا جس کو تاریخ اسلام میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ تقریباً یکطرفہ تھا۔ اس میں یکطرفہ طور پر مخالف فریق کی تمام شرطوں کو مان لیا گیا تھا۔

پیغمبر اسلام یہ معاہدہ کرکے لوٹے تو راستہ میں ہی سورۃ الفتح نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ ہم نے تم کو کھلی فتح دیدی (الفتح ۱) یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ صلح حدیبیہ تو تمام تر فریق ثانی کے مطالبات پر مبنی تھی پھر اس کو فتح مبین کیوں کہا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس صلح میں ایک دفعہ یہ تھی کہ اب سے دس سال تک مسلمانوں اور قریش کے درمیان لڑائی نہیں ہوگی۔ اس اعتبار سے یہ معاہدہ گویا دس سال کا ناجنگ معاہدہ (no-war pact) تھا۔

قرآن نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین اس لئے قرار دیا کہ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں اور قریش کے درمیان مقابلہ کا میدان بدل گیا۔ پہلے دونوں کا مقابلہ جنگ کے میدان میں ہو رہا تھا، اب یہ مقابلہ فکر اور نظریہ کے میدان میں آگیا۔ جنگ کے میدان میں مقابلہ فیصلہ کن ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ کیوں کہ یہاں معاملہ مادی طاقت کا تھا اور مادی طاقت اگر مسلمانوں کے پاس تھی تو وہ قریش کے پاس بھی نسبتاً زیادہ مقدار میں موجود تھی۔ مگر نظریہ کے میدان میں معاملہ سراسر یکطرفہ تھا۔ اس میدان میں مسلمانوں کے پاس توحید تھی اور فریق ثانی کے پاس شرک۔ اور ظاہر ہے کہ فکری اعتبار سے توحید کے مقابلہ میں شرک کی کوئی طاقت نہیں۔ چنانچہ میدان مقابلہ بدلتے ہی تاریخ بدلنا شروع ہوگئی۔ اب اسلام کی فکری طاقت کے زور پر لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے لگے۔ شرک کا دائرہ گھٹنا شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ یہ عمل اس نوبت کو پہنچا کہ شرک کے پاس سرے سے انسانی طاقت (man power) ہی کا خاتمہ ہوگیا۔ اور جہاں انسانی طاقت نہ ہو وہاں کوئی بھی دوسری طاقت کام نہیں کرتی۔

نظامِ فطرت

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان کچھ مسائل میں مبتلا ہیں۔ مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ صبح و شام اس پر لکھتا اور بولتا رہتا ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام مسائل اغیار کے ظلم و سازش کی پیداوار ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے تمام مسائل اغیار کی سازشوں کا نتیجہ ہیں اور ان کا حل یہ ہے کہ ان سازشوں کے خلاف لڑائی کی جائے۔

مگر یہ صرف غلط فکری ہے، اور یہ غلط فکری ہی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ان حضرات کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے فطرت کے ایک قانون کو غیر قوموں کی سازش سمجھ لیا۔ حالاں کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے بارش سے پیدا ہونے والی کیچڑ کا الزام انسانوں کو دیا جانے لگے۔

یہ فطرت کا قانون ہے کہ دنیا میں انسانوں کے درمیان مقابلہ ہو، ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف چیلنج بنے۔ اسی نظامِ فطرت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جھٹکا لگتا ہے۔ کوئی شخص یا گروہ دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ نظام انسانی ترقی کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

ایسی حالت میں زد میں آنے والا گروہ اگر شکایت اور احتجاج کرے تو اس کا کوئی عملی فائدہ نہیں۔ اس کے بجائے اس کو چاہئے کہ وہ از سرِ نو اپنے آپ کو مستحکم بنائے۔ وہ صبر کے اصول کو اختیار کر کے اپنی تیاری کرے۔ وہ تلافی مافات کے اصول کو اختیار کر کے خود اپنے آپ پر عمل کرے۔

موجودہ زمانہ میں نئی قوتیں ظاہر ہوئیں۔ مثلاً ٹکنالوجی، سائنٹفک ایجوکیشن وغیرہ۔ مسلمان ان نئی قوتوں میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے۔ اسی بنا پر ہر جگہ وہ دوسری قوموں کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ اب اس کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنی علمی اور عملی کمیوں کو دور کریں، یہاں تک کہ ان کا وجود خود دوسری قوموں کے لئے چیلنج بن جائے۔

یہی اس دنیا میں کامیابی کی واحد ممکن تدبیر ہے۔ جہاں تک موجودہ قسم کی احتجاجی سیاست یا مطالباتی ہنگاموں کا تعلق ہے، اس سے مسلمانوں کو کچھ بھی ملنے والا نہیں۔ خواہ ان کو مزید ایک سو سال تک جاری رکھا جائے۔ ایسے احتجاجات انسان کے خلاف نہیں ہیں بلکہ وہ خالقِ فطرت کے خلاف ہیں اور کون ہے جو خالقِ فطرت سے لڑ کر کامیاب ہو۔

اسلامی سلوک، اسلامی حکومت

سعودی ہفت روزہ "المجلۃ" جس کا ہیڈ کوارٹر جدہ میں ہے اور وہ لندن سے چھپتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۲ - ۱۸ جون ۱۹۹۴ میں ولید صالح النمی کی تحریر چھپی ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ عرب ہیں اور اس وقت جارجیا (امریکہ) میں رہتے ہیں۔ ان کی تحریر کا خلاصہ ان کے اس جملہ میں ہے: اسلام ہماری قدیم وجدید مشکلات کے حل پر قادر ہے (الاسلام قادر علی حلِّ جمیع مشکلاتنا القدیمۃ والحدیثۃ) صفحہ ۹۲

اسی طرح دکتور یوسف القرضاوی کا ایک انٹرویو (حوار) ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (ذوالحجۃ ۱۴۱۴ھ) میں چھپا ہے۔ انہوں نے کسی قدر مختلف الفاظ میں دوبارہ یہی بات کہی ہے کہ اسلامی حل ہی مسلمانوں کو تخبط اور اضطراب اور ذلت اور عار سے نجات دے سکتا ہے (الحل الاسلامی ینقذ الامۃ من تخبطہا واضطرابہا وذلہا وعارہا) اس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اسلام کو عقیدہ سے لے کر تشریعات اور جمیع قوانین تک مکمل طور پر قائم اور نافذ کیا جائے۔ (صفحہ ۵۲)

مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل اسلام میں ہے۔ مگر اس سے مراد اسلامی حکومت نہیں ہے بلکہ اسلامی سلوک ہے۔ اگر مسلمانوں میں صحیح اسلامی فکر، اسلامی اسپرٹ اور اسلامی کردار پیدا ہو جائے تو یقیناً ان کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ مگر جب اسلامی نظام کے قیام یا اسلامی قوانین کے نفاذ کو ان کے مسائل کا حل بتایا جائے تو بات بالکل الٹ جاتی ہے۔ کیوں کہ موجودہ حالات میں اس قسم کی کوشش صرف مسائل ومشکلات میں اضافہ کرنے والی ہے، جیسا کہ بالفعل ساری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔

اسلامی حکومت کے قیام یا اسلامی قوانین کے نفاذ کی مہم لے کر اٹھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ موجودہ حکمرانوں سے غیر ضروری ٹکراؤ پیش آجاتا ہے۔ اس طرح مشکلات میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اسلامی سلوک کو اختیار کیا جائے تو کوئی نیا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا اور مسائل اچانک گھٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسلامی سلوک کی بنیاد محبت پر ہے، اور محبت فاتح عالم ہے۔ حکومت سے ٹکراؤ کی بنیاد نفرت پر ہے۔ اور نفرت تمام برائیوں کا سب سے بڑا سبب ہے۔

انتہا پسندی کا نتیجہ

موجودہ زمانہ میں جو اسلامی تحریکیں اٹھیں وہ اپنے بیان کردہ مقصد (اسلامی نظام کا قیام) کو تو حاصل نہ کر سکیں البتہ انھوں نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو ایک عظیم مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ ان تحریکوں کے پیدا کردہ نام نہاد انقلابی مزاج کی بنا پر موجودہ مسلمانوں کا یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ساری دنیا میں ان کے لئے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ یا ہلاکت یا منافقت۔ یا تو وہ حاصل نہ ہونے والے ایک نشانہ کے لئے نظام حاضر سے لڑ کر اپنے آپ کو تباہ کریں۔ یا نظام حاضر کو باطل سمجھتے ہوئے منافقانہ طور پر اس کے ساتھ موافقت کر کے رہیں۔ دین رحمت خود مسلمانوں کے لئے دین زحمت بن گیا۔

ان انقلابی تحریکوں نے یہ غلطی کی کہ عقیدہ اور سیاسی نظام کو ایک کر دیا۔ اسلام میں عقیدہ اور انفرادی طور پر متقیانہ عمل ہر شخص سے ہر حال میں مطلوب ہے۔ جہاں تک اجتماعی سیاسی نظام کا تعلق ہے، اس کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام کو قائم کرنے کی ذمہ داری صرف اس وقت مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جب کہ وہ بالفعل اس کو قائم کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ ورنہ سیاسی نظام کو قائم کرنا اسی طرح مسلمانوں کے لئے غیر مطلوب رہے گا جس طرح صاحب نصاب نہ ہونے کی صورت میں کسی مسلمان سے زکوٰۃ کی ادائیگی غیر مطلوب رہتی ہے۔

قرآن وحدیث کے مطابق یہی اسلام ہے۔ اس میں مسلمان کسی ایسی چیز کے مکلّف نہیں قرار پاتے جو ان کے بس میں نہ ہو۔ وہ ہر ماحول میں اس اساسی اسلام کو اختیار کر کے مطمئن رہ سکتے ہیں کہ وہ اللہ کے دین پر قائم ہیں۔

لیکن اسلام کی نام نہاد انقلابی تفسیر نے مسلمانوں کے اندر یہ ذہن بنایا کہ صرف عقیدہ اور انفرادی کردار نجات کے لئے کافی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ باطل قوتوں سے لڑ کر ساری دنیا میں اسلامی قانون کی حکومت قائم کریں۔ اس خود ساختہ نظریہ نے مسلمانوں کو ہر جگہ قائم شدہ حکومتوں سے ٹکرا دیا۔

چوں کہ مسلمان کہیں بھی طاقتور پوزیشن میں نہیں ہیں اس لئے اس بنا پر ان کے لئے صرف

دو میں سے ایک راہ باقی رہ گئی۔ یا تو اقتدار وقت سے ٹکرائیں اور اپنی کمزوری کی بنا پر یکطرفہ طور پر اپنے آپ کو ہلاک کریں یا مذکورہ عقیدہ کو ذہن میں بدستور باقی رکھتے ہوئے خارجی رویہ کے اعتبار سے منافق ہو جائیں۔ یعنی جس نظام کو وہ باطل اور حرام سمجھتے ہیں اس سے محض ذاتی مفاد کی خاطر مصالحت کرلیں۔

نیز ایسے انتہا پسند لوگ ہمیشہ بہت کم ہوتے ہیں جو جانتے بوجھتے اپنے آپ کو ہلاکت کے راستہ پر ڈالیں۔ چنانچہ تھوڑے سے سرپھرے قسم کے افراد نے ہر جگہ اپنے آپ کو ہلاکت خیز ٹکراؤ کے راستہ پر ڈال رکھا ہے۔ مگر ان کے سوا لوگوں کی اکثریت نے منافقانہ رویہ کو ترجیح دی ہے۔ وہ ہر ملک میں یہ کر رہے ہیں کہ اپنے ذہن میں یا نجی ملاقاتوں میں تو مروجہ نظام اقتدار کو باطل بتاتے ہیں مگر خارجی دنیا میں اسی باطل نظام کے ساتھ مکمل مصالحت کئے رہتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس کے بغیر انھیں عزت اور راحت کی زندگی نہیں مل سکتی۔

ہندستان میں بھی ایک اعتبار سے یہی صورت حال قائم ہے۔ مسلم لیگی قائدین نے نہایت بے معنی طور پر ہندو مسلم نفرت کا مزاج پیدا کیا۔ بعد کو جو مسلم لیڈر ان کے جانشین ہوئے انھوں نے بھی صرف اس مزاج کو پختہ کرنے میں مدد کی۔ اب نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان دو طرفہ مشکل میں مبتلا ہیں۔ ایک بہت محدود تعداد خفیہ یا علانیہ طور پر ہندوؤں سے بے نتیجہ ٹکراؤ میں مشغول ہے۔ کیوں کہ اس نے اس ٹکراؤ کو بزعم خود جہاد سمجھ رکھا ہے۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کی بیشتر تعداد وہ ہے جو ظاہری طور پر ہندوؤں سے مل جل کر رہنا پسند کرتی ہے۔ ان کا ذہن تو وہی ہے جو پہلے گروہ کا ہے لیکن وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندو اکثریت سے نفرت اور ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کر کے وہ اس ملک میں راحت اور عافیت کی زندگی نہیں بنا سکتے۔ اس لئے خالص مصلحت کی بنا پر، نہ کہ اصول کی بنا پر انھوں نے ہندو اکثریت سے ظاہری میل ملاپ کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔

یہ ایک خود عائد کردہ ذہنی عذاب ہے جس کو بہت سے لوگوں نے اپنے اوپر لاد رکھا ہے، خدا ورسول کے دین سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں۔

قانون کافی نہیں

پچاس سال پہلے ہندستان میں جو دستور بنایا گیا، اس میں دوسری بہت سی باتوں کے ساتھ ایک دفعہ اس مضمون کی بھی شامل کی گئی تھی کہ ـــــ ہندستان کے ہر شہری کا یہ فرض ہوگا کہ وہ قدرتی ماحول بشمول جنگل، جھیل، دریا اور جنگلی جانوروں کی حفاظت کرے اور انھیں ترقی دے، اور زندہ حیوانات کے ساتھ رحم دلی کا معاملہ کرے:

Constitution of India, Article 51-A;
It shall be the duty of every citizen of India to protect and improve the natural environment including forests, lakes, rivers and wildlife, and to have compassion for living creatures.

یہ دفعہ ہندستان کے بہترین دماغوں نے تحریر کی اور اس کو ہندستان کے اعلیٰ ترین دماغوں نے متفقہ طور پر منظور کیا۔ اس کے باوجود اس دفعہ پر ایک فی صد بھی عمل نہ ہو سکا۔ ہندستان کے جنگل نہایت بے دردی کے ساتھ کاٹے جارہے ہیں۔ ماحول میں ہر طرف کثافت کا اضافہ کیا جارہا ہے۔ اپنے محدود مفاد کے لئے جانوروں کو بری طرح مار ڈالا جاتا ہے۔ اس دفعہ کی خلاف ورزی کی آخری حد یہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں ہندستان کے جنگلوں میں تقریباً چار ہزار شیر پائے جاتے تھے۔ آج ہندستان میں صرف تین سو شیر رہ گئے ہیں جن کی بیشتر تعداد سندربن (مغربی بنگال) میں پائی جاتی ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی انسانی سماج میں کوئی اصلاح پیدا کرنے کے لئے قانون کا حصہ ہمیشہ بہت کم ہوتا ہے۔ انسانی سماج میں تبدیلی خود انسانوں کے اندر تبدیلی لانے سے آتی ہے نہ کہ کاغذ کے صفحہ پر یہ لفظ یا وہ لفظ لکھ دینے سے۔

انسانی سماج میں کوئی حقیقی تبدیلی ہمیشہ ذہنی انقلاب کے ذریعہ آتی ہے۔ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ایک ایک فرد کی سوچ کو بدلا جائے۔ ایک ایک فرد کے اندر مطلوب آمادگی پیدا کی جائے۔ ایک ایک فرد کے اندر اصلاحی اور تعمیری مزاج بنایا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک دیر طلب کام ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے، اس کے سوا کسی اور ذریعہ سے اس مقصد کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

۱۴ الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۳

غیرضروری ٹکراؤ

مسٹرالبرٹ ہورانی (Albert Hourani) مغربی ایشیا کے امور کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی مشہور کتاب ہے جس کا نام ہے —— عرب قوموں کی ایک تاریخ :

A History of the Arab Peoples

اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ عرب ملکوں کے لئے بہترین سیاسی پالیسی سیکولرزم ہے۔ ان کے الفاظ میں، مذہب اور سیاسی زندگی کی علیحدگی موجودہ دنیا میں کامیاب قومی زندگی کی واحد شرط ہے:

The separation of religion from political life seemed to be a condition of successful national life in the modern world.

موجودہ زمانہ میں روشن خیال طبقہ کا یہ کہنا ہے کہ مذہب کو نجی دائرہ میں محدود رہنا چاہئے۔ مذہب اور سیاست کے درمیان علیحدگی پرامن سماج کی تعمیر کے لئے لازمی شرط ہے۔ اس کے جواب میں موجودہ زمانہ کے اسلام پسند شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہب اور سیاست دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

یہ غیرضروری بحث ثنائی طرزفکر (dichotomous thinking) کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوگ صرف دو باتوں کے درمیان سوچ پاتے ہیں۔ یا مذہب مع سیاست یا مذہب بغیر سیاست۔ اسی لئے وہ ایک دوسرے کو اپنا مخالف سمجھ کر ان سے لڑنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ یہاں ایک تیسرا نقطۂ نظر بھی ہے۔ اور وہ تدریج سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی رائج الوقت نظام عملی طور پر مذہب کو جس دائرہ میں کام کا موقع دے رہا ہو اس دائرہ کو بلا بحث قبول کر لینا اور اس کو نقطۂ آغاز سمجھ کر اپنا کام فکری انداز میں شروع کر دینا۔

اس نزاع کا آسان حل یہ ہے کہ جس چیز کو سیکولر طبقہ اصولی تقسیم کے طور پر پیش کر رہا ہے اس کو اسلامی طبقہ عملی تقسیم کے طور پر مان لے۔ اس عملی بندوبست کے باوجود اسلامی طبقہ اپنے فکر کی پرامن تبلیغ بدستور جاری رکھ سکتا ہے جس کی موجودہ زمانہ میں اسے پوری آزادی حاصل ہے۔ ایسی حالت میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

بے شعوری

ایک مجلس میں میں نے پریگمیٹزم (pragmatism) کی حمایت کی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت یہ بھی ہے کہ نزاعی امور میں پریگمیٹک طریقہ اختیار کیا جائے۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان اس کو سن کر غصہ ہوگئے۔ انھوں نے تیز لہجہ میں کہا: آپ خدا کے رسول کو بنتھم اور میکیاولی کے برابر کر رہے ہیں۔

مذکورہ بزرگ کا یہ اعتراض صحیح نہ تھا۔ بنتھم (Jeremy Bentham) کا نظریہ خالص نفعیت (utilitarianism) کا نظریہ ہے۔ یعنی وہ منفعت ہی کو اصل قدر قرار دیتا ہے۔ اسی طرح میکیاولی کا نظریہ جس کو میکیاولیت (Machiavellianism) کہا جاتا ہے، وہ گویا تمام اخلاقی اصولوں کو منسوخ کرکے سیاسی مفاد کو اصل قرار دینے کے ہم معنی ہے۔ اس قسم کے نظریات بلاشبہ لغو بھی ہیں اور غیر اسلامی بھی۔

اس کے برعکس پریگمیٹک نقطۂ نظر سے مراد سادہ طور پر عملی نقطۂ نظر ہے۔ یعنی نزاعی معاملات میں جب فریق ثانی معیاری اصول کی روشنی میں تصفیہ کرنے پر راضی نہ ہو تو اس وقت عملی طور پر جو ممکن ہو اس پر رضامند ہو جانا۔ جیسے حدیبیہ کے عہد نامہ کی تحریر کے وقت قریش کے سردار "محمد رسول اللہ" لکھنے پر راضی نہ تھے۔ اس وقت آپ نے اس لفظ کو مٹا کر وہاں محمد بن عبداللہ لکھوا دیا۔ اس قسم کی عملیت زندگی کا ایک عام اصول ہے جس کو ہر آدمی ہر روز اپنے ذاتی معاملات میں اختیار کرتا ہے۔ اس کے بغیر موجودہ دنیا میں زندگی کی گاڑی کا چلنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔

یہی معاملہ ان لوگوں کا ہے جو الرسالہ کے صبر و اعراض والے مضامین پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ الرسالہ بزدلی کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ لوگ اپنی ناواقفیت کی بنا پر بزدلی میں اور صبر میں فرق نہیں کر پاتے۔ بزدلی ایک پست ہمتی اور بے غیرتی کی روش ہے۔ جب کہ صبر ایک اعلیٰ ترین انسانی سرگرمی ہے۔ صبر یہ ہے کہ اپنے جذبات کو روک کر ہوشمندی اور منصوبہ کے تحت معاملہ کیا جائے۔ بزدلی بدترین بے عملی ہے اور صبر اعلیٰ ترین عمل۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو غالباً کچھ لوگوں کی طرف سے اسی قسم کے تجربات ہوئے تھے جبکہ آپ نے فرمایا: الناس اعداء ما جهلوا۔ یعنی لوگ اس چیز کے دشمن ہو جاتے ہیں جس سے وہ ناواقف ہوں۔

سنت اللہ

احد کی جنگ (۳ ھ) میں مسلمانوں کو اپنے مخالفین کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس پر مخالفین نے یہ پروپگنڈہ شروع کر دیا کہ اللہ مسلمانوں کا ساتھی نہیں ہے، وہ ہمارے ساتھ ہے۔ قرآن میں اس کی تردید کی گئی اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو (آل عمران ۱۳۹) اور یہ کہ اللہ تمہارا مددگار ہے اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔ (آل عمران ۱۵۰)

اس سلسلہ میں مزید کہا گیا کہ ہم منکروں کے دل میں تمہارا رعب ڈال دیں گے۔ کیونکہ انھوں نے ایسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرایا جس کے حق میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے ظالموں کے لئے۔ اور اللہ نے (احد کے دن) تم سے اپنے وعدہ کو سچا کر دکھایا تھا جب کہ تم ان کو اللہ کے حکم سے قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم خود کمزور پڑ گئے اور تم نے معاملہ میں اختلاف کیا اور تم کہنے پر نہ چلے، جب کہ اللہ نے تم کو وہ چیز دکھائی تھی جس کو تم چاہتے تھے۔ تم میں سے بعض دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے بعض آخرت چاہتے تھے۔ پھر اللہ نے تمہارا رخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے، اور اللہ نے تم کو معاف کر دیا۔ اور اللہ ایمان والوں کے حق میں بڑا فضل والا ہے (آل عمران ۵۲-۱۵۱)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت بتائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ بے شک اہل ایمان کی مدد کرتا ہے۔ اور اس کی مدد اس بات کی یقینی ضمانت ہے کہ اہل ایمان کو اپنے مخالفین کے مقابلہ میں فتح و کامیابی حاصل ہو۔ مگر موجودہ دنیا دار الامتحان ہے، اس لئے یہاں خود اہل ایمان کو بھی اپنا ایک حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر اہل ایمان اپنے حصہ کا کردار ادا نہ کریں تو اللہ کی مدد آنے کے باوجود کامیابی نہ ہوگی، حتی کہ جیتی ہوئی جنگ بھی ہار میں تبدیل ہو جائے گی، جیسا کہ رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں احد کے موقع پر پیش آیا۔

اس دنیا میں شکست ہمیشہ اپنے حصہ کا کردار ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے، اور دوبارہ اپنے حصہ کا کردار ادا کر کے ہی شکست کو فتح میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

دعوت الی اللہ

ایک ہندستانی عالم سعودی عرب گئے۔ وہ ایک دینی جماعت کے سربراہ ہیں۔ وہاں انھوں نے ایک انٹرویو دیا جو ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ کے شمارہ ۱۹ ذی القعدہ ۱۴۱۲ھ (۲۱ مئی ۱۹۹۲ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک سوال یہ ہے:

س۔ ماھی الانشطۃ التی تقوم بھا جمعیتکم فی مجال الدعوۃ الی اللہ ؟

ج۔ من ابرز انشطۃ جمعیتنا فی مجال الدعوۃ الاسلامیۃ تنظیم المحاضرات والندوات والمؤتمرات الاسلامیۃ لمناقشۃ وضع المسلمین فی الھند۔

الدعوۃ کے نمائندہ (فہد البکران) نے سوال کیا کہ وہ کون سی سرگرمیاں ہیں جو آپ کی جماعت دعوت الی اللہ کے میدان میں انجام دے رہی ہے۔ ہندستانی عالم نے جواب میں کہا کہ دعوت اسلامی کے میدان میں ہماری جماعت کی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ نمایاں سرگرمی ہندستان میں مسلمانوں کی حالت کے بارہ میں لکچروں اور سیناروں اور کانفرنسوں کا انعقاد ہے۔

یہی موجودہ زمانہ کے علما اور دانشوروں کا عام ذہن ہے۔ وہ مسلمانوں کے مسائل پر تقریر وتحریر کی سرگرمیاں دکھاتے ہیں اور اس کو دعوت الی اللہ کا کام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کے کسی کام کا دعوت الی اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔

مسلمانوں کی اصلاح یا مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے کوشش کرنا بذات خود ایک مطلوب کام ہے۔ مگر اس کا صحیح نام اصلاح المسلمین ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔ دعوت الی اللہ اسلام میں اس کام کا عنوان ہے جو غیر مسلمین میں اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے انجام دیا جاتا ہے۔

دعوت الی اللہ ایک بے حد نازک ذمہ داری ہے جو غیر مسلموں کے تئیں اہل اسلام کے اوپر مقرر کی گئی ہے۔ یہ کام سراپا صبر، خیر خواہی، حکمت اور موعظت حسنہ کے جذبہ کے تحت انجام دیا جاتا ہے۔ اس میں مدعو کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جاتا ہے۔ داعی کسی بھی حال میں مدعو سے کوئی قومی یا مادی نزاع نہیں چھیڑتا۔ یہ وہ کام ہے جس میں ضروری ہوتا ہے کہ داعی فریق ثانی کی اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہو۔ وہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دے اور تعصب اور ظلم کے باوجود مدعو کے حق میں دعا کرتا رہے۔

دو طریقے

اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز یہ ہے کہ ممکن سے اپنے عمل کا آغاز کیا جائے، اور ناکامی کا واحد سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اپنی قوت اور طاقت کو ناممکن کے حصول میں لگا دیا جائے۔ انسانوں کی کامیابی اور ناکامی کی پوری تاریخ انھیں دو اصولوں کی تفصیل وتشریح ہے۔

اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ متشددانہ طریق کار آدمی کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور پرامن طریق کار کامیابی کی طرف۔ متشددانہ طریق کار ہمیشہ بے صبری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں پرامن طریق کار وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو نزاعی معاملات میں صبر وتحمل کا ثبوت دے سکیں۔ امن کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے، اور صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ امن کی طاقت کو کامیاب طور پر استعمال کر سکے۔

بیشتر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کیا ہونا چاہئے، اور کیا ہو سکتا ہے کے درمیان فرق نہیں کر پاتے۔ وہ اپنی شعوری ناپختگی کی وجہ سے اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ وہ منزل کی طرف اپنا سفر طے کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر میں انھیں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف وقت ضائع کیا۔ اپنے وقت اور اپنی طاقت کو آخری حد تک استعمال کرنے کے باوجود وہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔

انسان پیدائشی طور پر معیار پسند ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے ذہن میں ایک معیاری دنیا کا تصور بنا ہوا ہے۔ مگر دوسری ناگزیر حقیقت یہ ہے کہ اس دار الامتحان میں کسی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی معیاری دنیا کو حاصل کر سکے۔ عملی طور پر جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے پسندیدہ معیار سے کم کو لینے پر راضی ہو جائے۔ وہ کیا ہونا چاہئے کو چھوڑ کر کیا ہو سکتا ہے کو اپنا عملی نشانہ بنائے۔

جب آپ وہ چیز حاصل کرنا چاہیں جو ممکن نہیں ہے تو آپ کے اندر جھنجھلاہٹ اور تشدد پیدا ہوگا۔ لیکن جب آپ ممکن کو حاصل کرنے کے لئے اٹھیں تو آپ کے اندر یقین ہوگا۔ آپ کی جدوجہد پُرامن دائرہ میں جاری ہوگی۔ پہلی صورت میں آپ کی پوری سوچ منفی سوچ بن جائے گی، اور دوسری صورت میں آپ کی سوچ مثبت سوچ بنے گی۔ اعلیٰ انسانی صفات آپ کے اندر پرورش پائیں گی۔

اسوۂ حسنہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم مکہ میں دعوت کا کام شروع کیا تو مکہ کے لوگ، خاص طور پر وہاں کے سردار آپ کے سخت مخالف ہو گئے۔ انھوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو سخت ترین تکلیفیں دیں۔ مگر آپ کو حکم دیا گیا کہ تم کوئی جوابی کارروائی نہ کرو بلکہ یکطرفہ طور پر ان کی سختیوں کو نظر انداز کرو (دع اذاہم)

اس طرح آپ ۱۳ سال تک صبر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ آپ کی جان کے دشمن ہو گئے۔ انھوں نے تلوار لے کر آپ کے مکان کو گھیر لیا۔ اس وقت بھی آپ نے مقابلہ نہیں کیا۔ بلکہ اللہ کے حکم سے آپ خاموشی سے مکہ سے نکل کر مدینہ چلے گئے۔

مکہ کے لوگ اب بھی چپ نہیں بیٹھے۔ انھوں نے دھمکیاں دیں کہ وہ مدینہ پر حملہ کریں گے اور اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو ختم کر دیں گے۔ چنانچہ، ہجرت مدینہ کے ابتدائی دور میں آپ مہاجرین کے چھوٹے چھوٹے دستے مکہ کے راستوں پر بھیجتے تھے تاکہ مکہ والوں کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کریں اور ان کے جارحانہ اقدام سے پیشگی طور پر باخبر ہو جائیں۔

رمضان ۲ھ میں ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی حفاظت کے نام پر قریش کے تقریباً تمام سردار ایک طاقت ور فوج لے کر نکلے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ تجارتی قافلہ کو بچانے کے بعد مدینہ پر حملہ کریں۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے براہ راست حکم کے تحت مدینہ سے نکلے۔ اللہ نے خصوصی طور پر فرشتوں کے ذریعہ اہل اسلام کی مدد کی۔ دونوں کے مقابلہ میں اہل مکہ کو زبردست شکست ہوئی۔

اس کے بعد بھی اہل مکہ خاموش نہیں رہے۔ انھوں نے بار بار جارحیت کرنا چاہا۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ٹکراؤ سے بچتے رہے۔ تاہم احد اور حنین کے موقع پر وہ یکطرفہ طور پر اہل اسلام پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے نتیجہ میں جنگ واقع ہوئی۔

پیغمبر اسلام کا مقصد مخالفین کو قتل کرنا نہیں تھا بلکہ ان کو اسلام کے دائرہ میں داخل کر کے انھیں اسلام کی طاقت بنانا تھا۔ چنانچہ آپ نے حدیبیہ کے موقع پر یکطرفہ شرائط پر اہل مکہ سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا تاکہ دونوں فریقوں کے درمیان معتدل فضا قائم ہو اور دعوت کا عمل مؤثر انداز میں جاری ہو سکے۔

صلح حدیبیہ نے اہل اسلام کے لئے دعوت کے مواقع کھول دئے۔ چنانچہ تاریخ نے دیکھا کہ صرف دو سال کے اندر لوگ اتنی بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہوئے کہ کسی جنگ کے بغیر صرف عددی طاقت کے ذریعہ اسلام پورے عرب پر غالب آ گیا۔

صحت فکر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے : اَللّٰھم اَرِنا الحقّ حقاً و ارزقنا اتباعه و ارنا الباطل باطلاً و ارزقنا اجتنابه و اَرِنا الا شیاء کما ھی (اے اللہ، حق کو ہمیں حق کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس کی پیروی کی توفیق دے۔ اور باطل کو ہمیں باطل کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس سے بچنے کی توفیق دے۔ اور چیزوں کو ہمیں ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں)

یہ گویا صحت فکر کی دعا ہے۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے یہاں ہر چیز پر التباس کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ کوئی بات جب آدمی کے سامنے آتی ہے تو ہمیشہ اس کا خطرہ رہتا ہے کہ وہ اس کو غلط رخ سے لے لے۔ اور پھر اس غلط تاویل کے لئے اس کو خوبصورت الفاظ بھی مل جائیں۔ اس فتنہ سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ آدمی رائے قائم کرنے میں بے حد محتاط ہو۔ نیز اس معاملہ میں وہ مذکورہ دعا سے برابر مدد لیتا رہے۔

مثلاً آپ توحید خالص کا نظریہ پیش کریں گے اور سننے والا فوراً انسانی بادشاہوں کی مثال دے کر کہنے لگے گا کہ ٹھیک ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ مگر بادشاہوں تک پہنچنے کے لئے درمیانی وسائل ہوتے ہیں۔ اسی طرح خدا تک پہنچنے کے بھی درمیانی وسائل ہیں۔ آپ ایک شخص کے سامنے قرآن کی آیت پیش کر کے کہیں گے کہ دشمن سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آؤ، اس کے بعد تم دیکھو گے کہ دشمن بھی تمہارا گہرا دوست بن گیا ہے۔ وہ شخص کہے گا کہ یہ تو تم بے غیرتی کی بات کر رہے ہو۔ ہمیں تو دشمن کو سبق سکھانا ہے، اس کے بغیر وہ اپنی مخالفانہ کارروائی سے باز نہیں آسکتا۔ آپ قرآن وحدیث کا حوالہ دے کر کہیں گے کہ اس دنیا میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے، اور آپ کا مخاطب اس کی تردید میں یہ الفاظ پالے گا کہ یہ تو بزدلی کی تعلیم ہے۔ اسلام کا طریقہ اقدام کا طریقہ ہے، اسلام کا طریقہ پسپائی کا طریقہ نہیں۔

چیزوں کو صحیح رخ سے دیکھنا اور معاملات میں صحیح رائے قائم کرنا، خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کے مالک وہی لوگ بنتے ہیں جو غلط تاویلات کے فتنہ سے اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔

اسلام کی پکار

اسلام کی تاریخ میں مکہ کا ۱۳ سالہ دور دعوتی محنت (dawa activism) کا دور ہے۔ اور اس کے بعد کا ہزار سالہ دور دعوتی عمل (dawa process) کا دور۔ ابتدائی ۱۳ سالہ دور میں پیغمبرؐ اور آپ کے اصحاب نے جو دعوتی محنت کی اس ڈھنگ کی دعوتی محنت، معلوم تاریخ کے مطابق اسلام میں دوبارہ نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود اسلام کی اشاعت اور توسیع مسلسل جاری رہی۔ اسی کے نتیجہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ آج مسلمان دنیا بھر کے تمام ملکوں میں قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی ۱۳ سالہ محنت اتنی عظیم اور ہمہ گیر تھی کہ اس کے اثرات بعد کی انسانی تاریخ میں بطور عمل (process) جاری ہو گئے۔ مکہ کے انداز کی براہ راست دعوتی محنت کے بغیر اسلام خود اپنی طاقت سے انسانی آبادیوں میں مسلسل پھیلتا رہا۔

اس اشاعتی عمل میں اگر کبھی وقتی رکاوٹ پڑی تو صرف اس وقت پڑی جب کہ مسلمان اور غیر مسلمان (داعی اور مدعو) میں کوئی نزاع یا ٹکراؤ پیش آیا اور اس کی بنا پر دونوں کے درمیان نفرت اور تلخی کی فضا پیدا ہو گئی۔ مثلاً صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں یورپ کی مسیحی قوموں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا ہونا۔ یا ایشیائی ملکوں میں نوآبادیاتی نظام کے سبب سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تلخی اور کشیدگی کا ماحول بن جانا۔ یا ہندستان میں دو قومی سیاست کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوری پیدا ہو جانا۔

یہ تجربہ بتاتا ہے کہ مذکورہ دعوتی عمل خود اپنی طاقت سے تاریخ میں جاری ہے۔ وہ اگر کبھی رکتا ہے تو صرف ایک سبب سے رکتا ہے، اور وہ ہے —— داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات کا ختم ہو جانا۔

ایشیائی نسبت سے اس معاملہ کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں غیر مسلم قومیں جدید قوتوں سے مسلح ہو کر مسلم قوموں پر غالب آگئیں۔ اس واقعہ کو مسلمانوں نے اپنے لئے قومی ذلت سمجھا اور ساری دنیا میں وہ غیر مسلم قوموں سے لسانی یا عملی جنگ میں مشغول

ہو گئے۔ اس ٹکراؤ میں واضح اسباب کی بنا پر مسلمانوں کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس طرح انھیں دوبارہ غلبہ کا مقام تو نہیں ملا، البتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کا پہاڑ کھڑا ہو گیا۔

قدیم زمانہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان لڑائیاں ہوتی تھیں۔ مگر اس زمانہ میں وہ چیز موجود نہ تھی جس کو میڈیا کہا جاتا ہے۔ اس لئے قدیم جنگوں کے اثرات صرف میدان جنگ تک محدود ہو کر رہ جاتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں میڈیا نے اس کو عالمی خبر کی حیثیت دیکر ایک ایک شخص تک اسے پہنچا دیا۔

اب ضرورت ہے کہ پورے معاملے پر از سر نو غور کیا جائے۔ اور ان حالات کو پھر سے تاریخ میں واپس لایا جائے جس میں دعوت کا عمل دوبارہ جاری ہو سکے۔ اس کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان یک طرفہ صبر کا طریقہ اختیار کریں۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں، بالفاظ دیگر داعی اور مدعو کے درمیان جو نفرت اور کشیدگی پیدا ہو گئی ہے وہ اتنی گہری ہے کہ اب اس کو صرف یک طرفہ کارروائی ہی کے ذریعہ روکا جاسکتا ہے۔ نفرت کی یہ فضا کبھی بھی دو طرفہ بنیاد پر ختم نہیں ہو سکتی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں ہی کو یہ کرنا ہے کہ وہ یکطرفہ عمل کے ذریعہ اس کے خاتمے کو یقینی بنادیں، تاکہ دعوت کا عمل دوبارہ نارمل حالت میں جاری ہو جائے جس طرح وہ پہلے ساری دنیا میں جاری تھا۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں (داعی اور مدعو) کے درمیان نارمل تعلقات انتہائی طور پر ضروری ہیں۔ نارمل فضا میں ہی یہ ممکن ہے کہ ایک شخص دوسرے کے نقطۂ نظر پر غور کرے۔ یہ ایک ایسی فطری حقیقت ہے جس کی مثالیں ہر طرف بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے حال کی ایک سادہ مثال لیجئے۔

۱۳ مئی ۱۹۹۴ کو دہلی میں میری ملاقات ایک مسلم نوجوان مسٹر منصور سے ہوئی۔ وہ دہلی کے ایک اسکول (ایئر فورس بال بھارتی) میں پڑھتے ہیں۔ اس وقت وہ بارھویں درجہ کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے اسکول میں جب دو طالب علم آپس میں ملتے ہیں تو امریکی طریقہ کے مطابق وہ ایک دوسرے کو ہائے (Hi) کہتے ہیں۔ مگر ہم چند مسلمان طالب علم جب آپس میں ملتے ہیں تو ہم ایک دوسرے کو السلام علیکم کہتے ہیں۔ غیر مسلم طلبہ نے جب اس کو سنا تو انھوں نے پوچھا

کہ یہ تم آپس میں کیا کہتے ہو۔ انھوں نے بتایا کہ یہ عربی کلمہ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اوپر سلامتی ہو:

May peace be upon you.

غیر مسلم طلبہ نے اس کو بہت پسند کیا اور کہا کہ گریٹنگ کا یہ کتنا اچھا طریقہ ہے۔ اس کے بعد وہ خود بھی السلام علیکم کہنے لگے۔ حتی کہ بعض طلبہ اتنا متاثر ہوئے کہ کہا کہ ہم تمہارے ساتھ نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ ایک غیر مسلم نوجوان نے خاص طور پر درزی سے اپنے لئے مسلم لباس (شلوار اور قمیص اور ٹوپی) سلوایا اور اس کو پہن کر مسٹر منصور کے ساتھ مسجد میں گیا اور عید کی نماز ادا کی۔ اسی طرح ایک طالب علم نے رمضان کے مہینہ میں ایک روزہ رکھا۔ کئی غیر مسلم طلبہ آپس میں کہنے لگے کہ جھٹکا مت کھاؤ، حلال میٹ کھاؤ، وہ زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ وغیرہ۔

مذکورہ اسکول میں چند مسلمان ہیں۔ باقی سب کے سب غیر مسلم ہیں۔ یہاں بالکل لبرل ماحول ہے۔ مسلم اور غیر مسلم کشیدگی سے اس کا ماحول یکسر خالی ہے۔ اس فضا کی بنا پر یہاں مسلم طلبہ اور غیر مسلم طلبہ کی ملاقات بالکل فطری ماحول میں ہوتی ہے۔ ان کے درمیان دوری اور توحش کی دیوار حائل نہیں ہوتی۔ اس کا قدرتی نتیجہ وہ تاثر ہے جس کی مثال اوپر نقل کی گئی۔

معتدل ماحول میں یہ اختلاط (interaction) جو مذکورہ اسکول میں جزئی طور پر پایا جاتا ہے، یہی ماحول اگر پورے ملک میں اور ساری دنیا میں کلی طور پر پیدا ہو جائے تو اپنے آپ اسلام کی اشاعت ہونے لگے۔ اسلام چوں کہ غیر محرف مذہب ہے اور دوسرے مذاہب سب کے سب محرف مذہب، اس لئے محض سادہ تقابل ہی لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ تقابل معتدل فضا میں پیش آیا ہو۔

اقدام، دفاع

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں جو واقعات پیش آئے ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ آپ نے جب فرعون کے سامنے اپنا عصا ڈالا اور وہ اژدہا بن کر چلنے لگا تو فرعون نے کہا کہ یہ جادو ہے اور ہم جوابی جادو کے ذریعہ اس کو باطل ثابت کر دیں گے۔ چنانچہ مصریوں کے قومی تیوہار کے دن مصر کے ماہر جادوگر جمع کئے گئے تاکہ وہ اپنا کرتب دکھا کر حضرت موسیٰ کو شکست دیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مصر کے یہ جادوگر جمع ہوئے تو انھوں نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ تم پہلے اپنا عصا ڈالو گے یا ہم جو ڈالنا چاہتے ہیں اس کو ہم پہلے ڈالیں۔ حضرت موسیٰ نے کہا کہ تم ہی پہلے ڈالو۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری رسیاں اور لکڑیاں میدان میں ڈال دیں جو سانپ کی مانند چلتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو وہ اژدہا بن کر سب کو نگل گیا (الاعراف ۱۲۰-۱۱۵)

یہ حضرت موسیٰ کا وہ طریقہ تھا جو آپ نے جادوگروں سے عملی مقابلہ کے وقت اختیار کیا۔ مگر دعوت کے موقع پر آپ کی روش اس سے مختلف تھی۔ جب آپ داعی کی حیثیت سے فرعون کے دربار میں گئے تو آپ نے فرعون سے یہ نہیں کہا کہ پہلے تم اپنا نظریہ بیان کرو، اس کے بعد میں اپنا پیغام تمہارے سامنے رکھوں گا۔ بلکہ آغاز کر کے خود ہی آپ نے اپنا پیغام اس کے سامنے پیش کر دیا۔

اس فرق سے پیغمبرانہ طریق کار کا ایک بنیادی اصول معلوم ہوتا ہے۔ پیغمبر اپنے مخالفین کے ساتھ عملی مقابلہ کے لئے کبھی پہل نہیں کرتا۔ وہ صبر و اعراض کی روش پر قائم رہتے ہوئے آخر وقت تک فریق مخالف کو موقع دیتا ہے کہ وہ خود پہل کرے۔ فریق مخالف جب اس طرح پہل کی ذمہ داری اپنے اوپر لے چکا ہو اس وقت پیغمبر اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کے مقابلہ پر آتا ہے اور اللہ کی مدد سے اس کو زیر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

مگر نظریاتی دعوت کے معاملہ میں پیغمبر کا طریقہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں پیغمبر خود پہل کرتا ہے۔ یہاں پیغمبر کا طریقہ یک طرفہ طور پر اپنی طرف سے آغاز کرنے کا ہے۔ پیغام رسانی کے معاملہ میں پیغمبر کا طریقہ اقدام کا ہوتا ہے اور عملی ٹکراؤ کے معاملہ میں پیغمبر کا طریقہ دفاع کا۔

صدعن سبیل اللہ

قرآن میں جن مجرمانہ افعال کا ذکر ہے ان میں سے ایک نہایت سنگین جرم وہ ہے جس کے لئے صدعن سبیل اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی اللہ کے راستہ سے روکنا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہ بہت برا کام ہے (التوبہ ۹) اس سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں (محمد ۳۲) ایسے لوگوں کی مغفرت نہیں ہوگی (محمد ۳۴) بلکہ انھیں عام گنہ گاروں سے زیادہ سخت عذاب دیا جائے گا (النحل ۸۸) صدعن سبیل اللہ کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل آیت کا مطالعہ کیجئے:

ومن اظلم ممن افترى على الله كذبا اولئك يعرضون على ربهم ويقول الاشهاد هؤلاء الذين كذبوا على ربهم ألا لعنة الله على الظلمين الذين يصدون عن سبيل الله ويبغونها عوجا وهم بالآخرة هم كافرون۔

ھود ۱۸ - ۱۹

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے۔ ایسے لوگ اپنے رب کے سامنے پیش ہونگے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو، اللہ کی لعنت ہے ظالموں کے اوپر، ان لوگوں کے اوپر جو اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں، اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ صدعن سبیل اللہ یہ ہے کہ دعوت حق میں ٹیڑھے مطلب نکالے جائیں اور اس طرح داعی اور دعوت کی سچائی کو لوگوں کی نظر میں مشتبہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام ہمیشہ وقت کے خواص کرتے ہیں۔ وہ داعی کی شخصیت اور داعی کے پیغام میں اپنی ذہانت سے ایسے الٹے پہلو نکالتے ہیں جن کا تجزیہ عوام نہ کرسکیں اور داعی اور اس کی دعوت کی طرف سے شبہ میں پڑ جائیں۔

جو لوگ ایسا کریں وہ گویا خدا کے اوپر جسارت کر رہے ہیں۔ وہ قیامت کے دن خدا کی عدالت میں حاضر کئے جائیں گے۔ اس وقت وہی داعی جن کو انھوں نے دنیا میں حقیر کیا اور ان کے پیغام کو قابل نفرت انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا، وہی ان کے اوپر گواہ بن کر کھڑے ہوں گے اور بتائیں گے کہ کس طرح انھوں نے اپنی جھوٹی باتوں سے خلق خدا کو حق سے پھیرنے کی کوشش کی تھی۔

اختلاط کی ضرورت

کشمیر کے دو نوجوان دہلی آئے۔ وہ چند دن دہلی میں گھومے۔ اس کے بعد ان سے میری ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ انڈیا (اور دہلی کے بارہ میں) ہمارے خیالات بہت خراب تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ سارے ہندو متعصب ہیں۔ وہ مسلمانوں کے سخت دشمن ہیں۔ مگر دہلی میں چند دن قیام کے دوران ہم جس ہندو سے بھی ملے۔ وہ ہم سے بہت خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آیا۔ حالاں کہ ہمارے حلیہ کو دیکھ کر اور ہماری بولی کو سن کر وہ فوراً سمجھ جاتے تھے کہ ہم کشمیری ہیں۔ ہم ہندو کو بہت برا سمجھے ہوئے تھے مگر وہ تو اسی طرح اچھے انسان ہیں جس طرح ہم اپنے کو اچھا انسان سمجھتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ جب ہندوؤں سے آپ کا سابقہ نہیں پڑا تھا تو آپ نے ہندوؤں کو برا کیسے سمجھ لیا۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر کے اردو اخباروں کے ذریعہ۔ ہم کشمیر میں اپنے اخبارات پڑھتے ہیں۔ پاکستان کا ریڈیو اور ٹی وی بھی ہم اکثر سنتے اور دیکھتے ہیں۔ ان ذرائع میں ہندو کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے وہ نہایت بری ہوتی ہے۔ وہ تو ہندو کا تعارف اس طرح کراتے ہیں جیسے کہ ہندو اسلام اور مسلمانوں کے ازلی اور پیدائشی دشمن ہیں۔ حالاں کہ دہلی کے تجربہ میں ہم نے پایا کہ یہ بالکل بے بنیاد پروپگنڈا ہے۔ اصل حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ صرف دو کشمیریوں کی بات نہیں۔ یہ ایک عام تاثر ہے۔ اگر آپ سروے کریں تو بہت سے مسلمان آپ کو اسی قسم کے احساس میں مبتلا ملیں گے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو دہلی میں غالب اکیڈمی کے ہال میں ایک سمپوزیم تھا۔ اس کے ایک اسپیکر عبد اللہ طارق تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ میری تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ وہاں ایک ہندو طالب علم ہریش میرا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گھر جاتے اور آپس میں کھاتے پیتے۔ ایک بار جب کہ میں ہریش کے گھر میں تھا، ایک بوڑھی ہندو خاتون نے کہا: طارق تو ایسا ہے کہ ذرا بھی مسلمان نہیں لگتا۔ یہی بات ایک روز طارق صاحب کے گھر کی ایک بوڑھی مسلم خاتون نے کہی: ہریش تو ایسا ہے کہ ذرا بھی ہندو نہیں لگتا۔

۱۹۴۷ سے پہلے کسی مسلم یا ہندو کے گھر میں ایسی بات نہیں کہی جاتی تھی۔ مگر آج ایسی باتیں عام ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پہلے ہندو یا مسلم اچھے ہوتے تھے۔ اور اب دونوں خراب ہو گئے ہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ باہمی تعلقات کا نہ ہونا ہے۔ ہر انسان بنیادی طور پر اچھا ہی ہوتا ہے۔ مگر جب باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں تو حقیقی واقفیت کی جگہ بدگمانیاں جنم لینے لگتی ہیں جو دھیرے دھیرے دونوں کی نظر میں ایک دوسرے کی تصویر کو بگاڑ دیتی ہیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان بڑی حد تک زراعتی دور میں تھا۔ تعلیم کے لئے روایتی ادارے قائم تھے۔ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر ان میدانوں میں شریک تھے۔ تعلیمی اداروں اور زراعتی سرگرمیوں میں دونوں فرقہ کے لوگ برابر آپس میں ملتے رہتے تھے۔ یہ اختلاط دونوں کے لئے براہ راست طور پر ایک دوسرے کو جاننے کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔

۱۹۴۷ کے بعد جو تعلیمی اور صنعتی انقلاب آیا اس میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہ گئے۔ موجودہ تعلیمی اور صنعتی اداروں میں آپ جائیں تو آپ دیکھیں گے وہاں ہندو بھرے ہوئے ہیں اور مسلمان بہت کم صرف خال خال نظر آتے ہیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں باہمی واقفیت کا ذریعہ باہمی ملاقاتیں تھیں۔ ۴۷ ۱۹ کے بعد کے دور میں دونوں کے لئے ایک دوسرے کو جاننے کا ذریعہ زیادہ تر اخبارات بن گئے۔ دور اول کی ملاقاتوں میں کسی فرد یا فرقہ کی پوری تصویر سامنے آتی تھی۔ مگر اخبارات اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے زیادہ تر بری باتوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ کیوں کہ اخباری مصلحت کے لئے وہی زیادہ کارآمد ہیں۔ اس بنا پر اخباری تعارف میں دونوں فرقہ ایک دوسرے کی صرف بری باتوں کو جانتا ہے۔ وہ ان کی اچھی باتوں سے واقف نہیں ہوتا۔

تعلیمی اور صنعتی دور میں پچھڑے پن کی وجہ سے مسلمان دوسری قوموں سے الگ ہو گئے ہیں۔ اگر وہ تعلیم اور صنعت کے میدان میں اس طرح داخل ہو جائیں کہ دوبارہ برادران وطن سے ان کا بھرپور اختلاط ہونے لگے تو ہر "ہریش" مسلمانوں کو طارق دکھائی دے گا اور ہر "طارق" ہندوؤں کو ہریش نظر آنے لگے گا۔

یہ سارا معاملہ اختلاط اور عدم اختلاط کا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲۸ الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۳

اقتباسات

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لئے صحیح اسلامی مسلک کیا ہے، اس کے بارہ میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ تمام علماء کم از کم نظری طور پر، یہی کہتے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو حسن اخلاق امن وصلح، صبر و تحمل، عالی ظرفی اور عدم منافرت کے اصولوں پر کاربند ہونا چاہئے۔ اسی میں ان کی دنیا کی بھلائی ہے اور اسی میں ان کی آخرت کی بھلائی بھی ـــــ حدیبیہ پرنسپل اسی پالیسی کا ایک علامتی عنوان ہے۔

ذیل میں اس سلسلہ میں چند علماء اور رہنماؤں کے بیانات نقل کئے جاتے ہیں۔ یہ صرف نمونہ کے طور پر ہے۔ ورنہ اس طرح کے بیانات تمام علماء اور مصلحین کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

مولانا سید حسین احمد مدنی، دیوبند

"تاریخ بتلاتی ہے کہ ہند میں ابتداءً جب مسلمان آئے، عام طور سے اہل ہند بودھ مذہب رکھتے تھے۔ اور (مسلمانوں سے) چھوت چھات تو درکنار بیاہ شادی تک بخوشی کرتے تھے، جس طرح آج بھی برما، سیام، چین، کاساپہاڑوں میں رائج ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اختلاط نے نہایت قوی تاثیر پیدا کی۔ خاندان کے خاندان مسلمان ہوگئے۔ مغربی پنجاب، خصوصاً سندھ میں مسلمانوں کی زیادتی کا بڑا راز یہی ہے۔ اس کے بعد جب محمود غزنوی کا زمانہ آتا ہے تو ہندوؤں میں مختلف احوال کی وجہ سے اشتعال پیدا ہوتا ہے اور شنکر اچاریہ عام مذہبِ ہند کو بودھ سے نکال کر برہمنی بناتا ہے۔ اور حکومتِ بودھ کی کمزوری کی بنا پر جو کہ افغانستان، بلوچستان، سندھ، لاہور سے فنا کر دی گئی تھی، اور وسط ہند کے بھی بودھ رجواڑے محمود غزنوی کے پے در پے حملوں سے یکسر کمزور ہوگئے تھے۔ شنکر اچاریہ کو عوام پر بڑی کامیابی حاصل ہوجاتی ہے۔ چاروں طرف دبے ہوئے برہمن جن کو بودھوں نے تقریباً دفن کر دیا تھا اُٹھ پڑتے ہیں۔ تھوڑی سی مدت میں پھر برہمنی مذہب اقطارِ ہند میں پھیل جاتا ہے۔ برہمن چونکہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام کا سیلاب اختلاط کی بنا پر ان کے اقتدار ہی کو نہیں بلکہ ان کے مذہب کو بھی مٹا رہا ہے، جس کی بنا پر ان کی مذہبی اور دنیاوی سیادتوں کا خاتمہ ہوجائے گا، اس لئے انھوں نے عوام میں نفرت کا

پروپگنڈا پھیلایا اور مسلمانوں کو ملیچھ کا خطاب دیا۔ گاؤکشی اور گوشت خوری کو اس کے لئے ذریعہ بنایا۔ ہندی عوام کی ذہنیت ہمیشہ سے تارکین دنیا کی پرستش کرنے والی واقع ہوئی ہے، خصوصاً ہندو ذہنیت جس قدر سادھو اور رفقیر کی پرستش کرتی ہے وہ اظہر من الشمس ہے، یہ ذہنیت بہت جلد شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک پھیل گئی۔ اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ چونکہ اسلامی قوت سے ان کو مقابلہ کرنے میں، باوجود مساعی عظیمہ کامیابی نہیں ہوئی، اس لئے اسی طریقہ پر ان کی جدوجہد محصور ہو گئی۔ بادشاہان اسلام نے اولاً اس طرف توجہ ہی نہیں دی، بلکہ وہ تمام باتوں کا قوت ہی سے مقابلہ کرتے رہے۔ مگر شاہان مغلیہ کو ضرور اس طرف التفات ہوا۔ خصوصاً اکبر نے اس خیال اور اس عقیدہ کو جڑ سے اکھاڑنا چاہا۔ اور اگر اس کے جیسے چند بادشاہ اور بھی ہو جاتے، یا کم از کم اس کی جاری کردہ پالیسی جاری رہنے پاتی تو ضرور بالضرور برہمنوں کی یہ چال مدفون ہو جاتی، اور اسلام کے دلدادہ آج ہندستان میں اکثریت میں ہوتے۔ اکبر نے نہ صرف اشخاص پر قبضہ کیا تھا بلکہ عام ہندو ذہنیت اور منافرت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ مگر ادھر تو اکبر نے نفس دین اسلام میں بھی کچھ غلطیاں کیں جن سے مسلم طبقہ میں اس سے بدظنی ہوئی۔ اگرچہ بہت سے بدظنی کرنے والے غافل اور ناسمجھ تھے۔ ادھر اپنی ناکامی کو دیکھ کر، برہمنوں کے غیظ وغضب میں اشتعال پیدا ہوا۔ ادھر یوروپین قومیں خصوصاً انگلستان کو اپنے مقاصد میں کامیابی کا ذریعہ تلاش کرنا پڑا، اور سب سے بڑا ذریعہ اس کا منافرت بین الاقوام تھا۔ لہٰذا اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوری بڑھتی چلی گئی۔

آپ کو معلوم ہے کہ صلح حدیبیہ ہی فتح مکہ اور فتح عرب کا پیش خیمہ ہے اور جس روز صلح حدیبیہ تمام وکمال کو پہنچی ہے اسی روز انا فتحنا لک فتحا مبینا کی آیت نازل ہوتی ہے، جس پر حضرت عمر تعجب کرتے ہوئے استفسار فرماتے ہیں: اوفتح یا رسول اللہ۔ آپس میں اختلاط کا ہونا، نفرت میں کمی آنا، مسلمانوں کے اخلاق اور ان کی تعلیمات کا معائنہ کرنا، دلوں سے ہٹ اور ضد کا اٹھ جانا، یہی امور تھے جنھوں نے افلاذ اکباد قریش کو کھینچ کر صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان بناتے ہوئے مکہ سے مدینہ کو پہنچا دیا۔ حضرت خالد بن ولید، عمرو بن العاص وغیرہ رضی اللہ عنہم اس طرح حلقہ بگوش اسلام بن گئے کہ قریش کی ہستی فنا ہو گئی۔ الغرض اختلاط باعث عدم تنافر ہے، اور وہ اقوام کو

اسلام کی طرف لانے والا ہے۔ اور تنافر باعث ضد ہے اور وہ عدم اطلاع علی المحاسن کا موجب ہے۔ اور وہ اسلام کی ترقی میں سد راہ ہونے والا ہے۔

چوں کہ اسلام تبلیغی مذہب ہے، اس لئے اس کا فریضہ ہے کہ جس قدر ہو سکے، غیر کو اپنے میں ہضم کرے نہ یہ کہ ان کو دور کرے۔ اس لئے اگر ہمسایہ قومیں ہم سے نفرت کریں تو ہم کو ان کے ساتھ نفرت نہ کرنا چاہئے۔ اگر وہ ہم کو نجس اور ملچھ کہیں تو ہم کو انھیں ایسا نہ کہنا چاہئے۔ اگر وہ ہم سے چھوت چھات کریں تو ہم کو ان سے ایسا نہ کرنا چاہئے۔ وہ ہم سے ظالمانہ برتاؤ کریں تو ہم کو ان کے ساتھ ظالمانہ اور غیر منصفانہ برتاؤ نہ کرنا چاہئے۔ اسلام پدر شفیق ہے، اسلام مادر مہربان ہے، اسلام ناصح خیر خواہ ہے۔ اسلام جالب اقوام ہے۔ اسلام ہمدرد بنی نوع انسان ہے۔ اس کو غیروں سے جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا پر کاربند ہونا شایانِ شان نہیں۔ (مکتوبات شیخ الاسلام، حصہ اول، مکتبہ دینیہ دیوبند، مکتوب نمبر ۶۳، صفحہ ۱۴۷-۱۴۱)

مولانا شبیر احمد عثمانی، دیوبند

(حدیبیہ کا) صلح نامہ لکھا قرار پایا تو اس سلسلہ میں بعض امور پر بحث و تکرار ہوئی۔ اور مسلمانوں کو غصہ اور جوش آیا کہ تلوار سے معاملہ ایک طرف کر دیا جائے۔ لیکن آخر حضورؐ نے مکہ والوں کے اصرار کے موافق سب باتیں منظور فرمالیں۔ اور مسلمانوں نے بھی بے انتہا ضبط و تحمل سے کام لیا اور صلح نامہ تیار ہوگیا۔ جس میں ایک شرط کفار کی طرف سے یہ تھی کہ آپ اس سال واپس چلے جائیے اور سال آئندہ بغیر سلح آکر عمرہ کر لیجیے۔ اور یہ کہ فریقین میں دس سال تک لڑائی نہ ہوگی۔ اس مدت میں جو مرد ہمارے ہاں سے تمہارے پاس جائے اسے آپ اپنے پاس نہ رکھیں اور جو تمہارا آدمی ہمارے ہاں آئے گا ہم واپس نہ کریں گے۔ صلح کا تمام معاملہ طے ہوجانے پر آپ نے حدیبیہ ہی میں ہدی کا جانور ذبح کیا۔ اور مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستہ ہی میں سورۃ الفتح نازل ہوئی۔ یہ سب واقعہ اواخر ۶ھ میں پیش آیا۔ حدیبیہ کی صلح بظاہر ذلت اور مغلوبیت کی صلح نظر آتی ہے۔ اور شرائط پڑھ کر بادیٔ النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام جھگڑوں کا فیصلہ کفار قریش کے حق میں ہوا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ بھی صلح کی ظاہری سطح دیکھ کر سخت محزون و مضطرب تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں ان احوال و نتائج کو دیکھ رہی تھیں جو دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل تھیں،

اور اللہ نے آپ کا سینہ سخت سے سخت ناخوش گوار واقعات پر تحمل کرنے کے لئے کھول دیا تھا۔ تا آنکہ یہ سورہ نازل ہوئی۔ اور خداوند قدوس نے اس صلح کا نام فتح مبین رکھا۔ لوگ اس پر تعجب کرتے تھے کہ یا رسول اللہ کیا یہ فتح ہے۔ فرمایا ہاں، بہت بڑی فتح ہے۔ اس صلح کے بعد کافروں اور مسلمانوں کو باہم اختلاط اور بے تکلف ملنے جلنے کا موقع ہاتھ آیا۔ کفار مسلمانوں کی زبان سے اسلام کی باتیں سنتے تو خود بخود ایک کشش اسلام کی طرف ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک، یعنی تقریباً دو سال کی مدت میں اتنی کثرت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے کہ کبھی اس قدر نہ ہوئے تھے۔

خالد بن الولید اور عمرو بن العاص جیسے نامور صحابہ اسی دوران میں اسلام کے حلقہ بگوش بنے۔ یہ جسموں کو نہیں، دلوں کو فتح کر لینا اسی صلح حدیبیہ کی عظیم ترین برکت تھی۔ اب جماعت اسلام چاروں طرف اس قدر پھیل گئی اور اتنی بڑھ گئی کہ مکہ کو فتح کر کے ہمیشہ کے لئے شرک کی گندگی سے پاک کر دینا بالکل سہل ہو گیا۔ حدیبیہ میں حضور کے ہمراہ صرف ڈیڑھ ہزار جانباز تھے۔ لیکن دو برس کے بعد مکہ کی فتح کے وقت دس ہزار کا لشکر آپ کے ہم رکاب تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ صرف فتح مکہ اور فتح خیبر، بلکہ آئندہ کی کل فتوحات اسلامیہ کے لئے صلح حدیبیہ بطور اساس و بنیاد اور زریں دیباچہ کی تھی۔ اور اس تحمل و توکل کی بدولت جو صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں ظاہر ہوئی، جن علوم و معارف اور باطنی مقامات کا فتح باب ہوا ہوگا اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ (تفسیر قرآن، صفحہ ۶۶۳)

مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

(حدیبیہ کے) صلح نامہ کی تکمیل کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے حدیبیہ کے مقام پر قربانیاں کیں، احرام کھولے اور حجامتیں بنوائیں۔ اس صلح نامہ یا عہد نامہ کے بعد قبیلہ خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف ہو گیا۔ اور قبیلہ بنو بکر قریش مکہ کا حلیف بن گیا۔ خزاعہ اور بنو بکر میں مدتوں سے عداوت چلی آرہی تھی۔ یہ دونوں چوں کہ ایک ایک فریق کے حلیف بن گئے، لہٰذا جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان امن و امان کے ساتھ رہنے کا عہد ہوا، اسی طرح ان دونوں میں بھی صلح قائم ہو گئی۔ جب آپ حدیبیہ سے مدینہ کو واپس تشریف لا رہے تھے تو راستہ ہی میں سورہ فتح نازل ہوئی اور خدا تعالیٰ نے اسی صلح کو جسے صحابہ کرام ایک قسم کی شکست سمجھ رہے تھے، فتح مبین قرار دیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ صلح اسلام کے لئے فتح مبین

ہی تھی۔ صحابہ کرام اس کو شکست اس لئے سمجھ رہے تھے کہ بظاہر بعض شرائط میں اپنے آپ کو دبا ہوا اور کمزور پاتے تھے۔ لیکن بہت جلد بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کمزور شرائط ہی بے حد مفید شرائط تھیں۔ اسلام کے لئے سب سے بڑی فتح یہ تھی کہ جنگ و پیکار کا سلسلہ ختم ہو کر امن و امان اور اطمینان حاصل ہوا۔ اسلام جس قدر امن و امان کی حالت میں اپنا دائرہ وسیع کر سکتا ہے، لڑائی اور جنگ و جدل کی حالت میں اس قدر نہیں پھیل سکتا تھا۔ اسلام کا اصل منشا یہی ہے کہ دنیا میں انسان امن و امان کی زندگی بسر کرے۔ اسلامی لڑائیاں لڑائیوں کے لئے نہیں تھیں بلکہ لڑائیوں کو مٹانے اور امن و امان قائم کرنے کے لئے تھیں۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد صرف دو برس کے عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد دگنی ہو گئی تھی۔ (تاریخ اسلام، حصہ اول، مکتبہ رحمت دیوبند، صفحہ ۲۰۲-۲۰۳)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ، لکھنؤ

۱۰ اکتوبر ۱۹۹۳ کو جے پور میں منعقدہ مسلم پرسنل لابورڈ کے گیارہویں اجلاس عام میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی خصوصی تقریر کا ایک اقتباس :

"میں یہ کہوں گا کہ آپ کی اور ہماری یہ زندگی ہوتی، شریعت پر عمل کرتے تو آپ کو میں یقین دلاتا شریعت کا طالب علم ہوں۔ کہ آج ہندستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی اور اسلام قبول کرنے کے لئے ایک بہت بڑا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوتا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ حضورؐ نے تیرہ سال مکہ مکرمہ میں قیام فرمایا اور دس سال مدینہ طیبہ میں۔ لیکن امام زہری جو سید التابعین کہلاتے ہیں جو کہتے ہیں (ابھی اس کا ذکر بھی ہو رہا تھا) صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان دو سال گزرے ہوں گے۔ ان دو سال کی قلیل مدت میں جتنی بڑی تعداد میں عرب کے لوگوں نے جو اسلام قبول کیا ہے اتنی بڑی تعداد میں پورے مکہ مکرمہ کے تیرہ سال کی مدت کے درمیان اور مدینہ طیبہ کے دس سال کی مدت میں قبول نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ عرب کے لوگوں کو اسلام کی عائلی زندگی کا، اخلاقی زندگی کا، عملی زندگی کا، باہمی سلوک کا مشاہدہ کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ ایک ایسی دیوار بیچ میں آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ مخالفت کی، مذہبی اختلافات کی جو دیکھنے نہیں دیتی تھی۔ اس میں کوئی ایسا جھروکہ نہیں تھا جس سے وہ جھانک سکتے۔ لیکن جب حدیبیہ کی صلح ہوئی، صلح نامہ لکھ لیا گیا۔ اور یہ طے ہو گیا کہ کوئی جنگ نہیں ہو گی اور کوئی مسلمان غیر مسلم پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا اس عرصہ میں، اور غیر مسلم مسلمان پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا تو جو لوگ ترستے تھے اپنے بھائیوں، اپنے بھتیجوں کی، اپنے چچا صاحبان کی صورت دیکھنے کو کہ جب سے مکہ معظمہ سے گئے ان کا مدینہ طیبہ آنا نہیں ہوا، ان کو موقع ملا اور وہ مدینہ طیبہ گئے۔ امام زہری کہتے ہیں کہ وہ لوگ اپنے عزیزوں

کے یہاں مہمان ہوئے تو انھوں نے زندگی کا نقشہ دوسرا دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ اللہ اکبر یہ زندگی، ہماری زبان ایک، ہمارا خون ایک، ہماری نسل ایک، ہماری تہذیب ایک، ہمارا کھانا پینا ایک، لیکن ہم میں ان میں اتنا فرق۔ یہ جھوٹ نہیں بولتے۔ یہ وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ یہ گالی گلوچ نہیں کرتے۔ ان کو غصہ نہیں آتا۔ یہ نماز بس نہیں چھوڑتے۔ یہ مہمانوں کو اپنے بچوں پر، اپنی بیویوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کو بھوکا رکھ کر ان کو کھلاتے ہیں۔ اس نے ان کو مائل کیا اور اس بڑی تعداد میں انھوں نے اسلام قبول کیا جس تعداد میں نہ مکہ معظمہ کے تیرہ سال کے قیام کے دوران اسلام قبول کیا اور نہ مدینہ طیبہ کے آٹھ سال کے دوران۔"

ماہنامہ ہدایت، جے پور، فروری ۱۹۹۴، صفحہ ۳۶-۳۷

مولانا ابوالکلام آزاد، دہلی

دسمبر ۱۹۴۷ میں لکھنؤ میں ایک مسلم کانفرنس ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس کے داعی اور صدر تھے۔ مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو رہنمائی دیتے ہوئے کہا:

"مسلمانوں کے موجودہ حالات اور ملک کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ کوئی چیز ضروری نہیں ہو سکتی کہ جہاں تک ملک کی سیاسی زندگی کا تعلق ہے، فرقہ پرستی کو جو مذہب کے نام سے ابھاری گئی ہے، ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا جائے۔ کسی ایک گوشہ کی فرقہ پرستی نہیں، کسی ایک جماعت کی فرقہ پرستی نہیں، سب کی فرقہ پرستی۔ ان بربادیوں سے جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کے بعد سے ہوتی رہی ہیں، بدقسمتی سے ہر فرقہ پرست جماعت کے لوگ اضافہ کرتے رہے۔ اور کوئی جماعت ایسی نہیں رہی جس پر خون کا دھبہ نہ لگا ہو۔ مسلمانوں کے ہاتھ پر خون کا دھبہ ہے۔ ہندوؤں کے ہاتھ پر بھی خون کا دھبہ ہے۔ اور سکھوں کے ہاتھ پر بھی خون کا دھبہ لگا ہوا ہے۔ مجھ سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کے ہاتھ پر خون کا دھبہ نہیں ہے اور وہ پاک ہے۔ جہاں تک فرقہ پرستی کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ یہ فرقہ پرستی ایک دروازہ سے نہیں آئی بلکہ کئی دروازوں سے آئی ہے۔ تو یہ سب دروازے بند ہونے چاہئیں۔ میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندستان میں جس آزادی کا ہم ۷۰ برس سے خواب دیکھ رہے تھے وہ برباد نہ ہو اور بربادی کسی نئے دروازے سے نہ گھس جائے تو ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ جس دروازہ سے یہ فرقہ پرستی آئی ہے اس دروازہ کو بند کر دیں اور

اس کو ختم کر دیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اس فرقہ پرستی کا ایک بہت بڑا دروازہ مسلم لیگ کی وجہ سے کھلا۔ واقعات اور حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ پرستی کا دروازہ مسلم لیگ نے کھولا۔ اب اگر وہ دروازہ بند نہیں کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ مشکلات کے حل کی بہت بڑی ذمہ داری مسلمانوں کے کندھے پر باقی رہتی ہے۔ (اس کے بغیر) مسلمانوں کی فلاح کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ جو چیز اس وقت مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ فرقہ پرستی کو روک کر اپنی قومی زندگی کو بچائیں اور جلد سے جلد بچائیں۔ (الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۲۴ مارچ ۱۹۷۳، صفحہ ۱۰)

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی

"(ہندستان میں اسلامی تحریک کا راستہ ہموار کرنے کے لئے) سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اس قومی کش مکش کا خاتمہ کیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اب تک برپا رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ بات پہلے بھی غلط تھی کہ مسلمان اسلام کے لئے کام کرنے کے بجائے اپنے قومی اغراض اور مطالبوں کے لئے لڑتے رہے۔ مگر اب تو اس لڑائی کو جاری رکھنا محض غلطی نہیں بلکہ مہلک غلطی اور احمقانہ خودکشی ہے۔ اب یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمان اپنے طرز عمل کو بالکل بدل دیں۔ یہ اسمبلیوں میں نمائندگی کے تناسب کا سوال، یہ انتخابات کی دوڑ دھوپ، یہ ملازمتوں کے لئے کش مکش، اور یہ دوسرے قومی حقوق اور مطالبوں کے لئے چیخ پکار، آئندہ دور میں لاحاصل ہوگی اور نقصان دہ بھی۔ لاحاصل اس لئے کہ اب جن لوگوں کے ہاتھ میں ہندستان کی حکومت آ رہی ہے وہ مخلوط انتخابات اور ملازمتوں میں صرف قابلیت کے لحاظ کا اصول مقرر کر کے مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی ہستی کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اور ان کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کسی طرح روکا نہیں جاسکتا۔ نقصان دہ اس لئے کہ اس حقوق کے استقرار کی جتنی کوشش بھی مسلمان کریں گے وہ ہندوؤں کے قومی تعصب کو اور زیادہ مشتعل کرے گی۔ اور اگر وہ اپنی شکایات کو رفع کرانے کے لئے پاکستان کی مدد حاصل کرنا چاہیں گے تو یہ بین اقوامی پیچیدگی اور کش مکش کا سبب بن جائے گا جس سے ہندو قوم پرستی کو زندگی کی مزید طاقت مل جائے گی۔ لہٰذا اب ہمیں وسیع پیمانے پر مسلمانوں میں ایسی رائے عام تیار کرنی چاہئے کہ وہ بحیثیت ایک قوم کے حکومت اور اس کے نظام سے بے رخی اختیار کرلیں۔ اور

ہندو قوم پرستی کو اپنے طرزِ عمل سے یہ اطمینان دلا دیں کہ میدان میں کوئی دوسری سیاسی قومیت اس کے ساتھ کش مکش کرنے کے لئے موجود نہیں ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے اس غیر معمولی تعصب کو ختم کر دینے کا جو اس وقت غیر مسلم اکثریت کے اندر اسلام کے خلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اور اسی طریقے سے غیر مسلموں کے اس اندیشے کو بھی دور کیا جا سکتا ہے کہ اگر اسلام کو مزید اشاعت کا موقع دیا گیا تو کہیں پھر کسی علاقہ کے مسلمان ایک اور پاکستان مانگنے کے لئے کھڑے نہ ہو جائیں۔ (تقریر مدراس ۲۶، اپریل ۱۹۴۷، ماخوذ از خطبۂ مدراس، مکتبہ اسلامی دہلی، صفحہ ۳۱ - ۳۲

ڈاکٹر اسرار احمد، لاہور

پاکستان کے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب "بھارت کے ساتھ مصالحت وقت کا تقاضا" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

" (اہل پاکستان) کو چاہئے کہ اس وقت بھارتی حکومت کو کوئی face-safing دیں۔ دنیا میں بھارت کو ایک جمہوریت تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہاں بہت مضبوط اپوزیشن موجود ہے جو اس کو ہلنے نہیں دے گی۔ اس حوالے سے جو ان کی شرائط ہیں کہ پہلے کچھ دیگر معاملات پر گفتگو کرنی چاہئے۔ فضا کو کچھ ہموار بنانا چاہئے تاکہ باہم بیٹھ کر ہم گفت گو کر سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں ہمیں صلح حدیبیہ کی مثال سامنے رکھنی چاہئے۔ ایک وقت میں کچھ نرمی دکھانا ہی کامیابی کی بہت بڑی دلیل بن جاتی ہے۔ صلح حدیبیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کے ساتھ جو مصالحت کی تھی وہ کس قدر غیر مساویانہ تھی۔ اس پر مسلمانوں کے خون کھول رہے تھے حضرت عمر کا ردعمل بھی کافی شدید تھا۔ میرے علم میں کوئی واقعہ نہیں ہے جس میں حضرت ابوبکر بھی حضور کے ساتھ نہ ہوں۔ لیکن اس موقع پر وہ بھی ساتھ نہیں تھے۔ کیوں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب احرام کھول دو اور یہیں قربانیاں دے دو تو (روایات کے مطابق)، ایک بھی صحابی نہیں اٹھا۔ گویا حضرت ابوبکر بھی نہیں اٹھے۔ دوبارہ کہا تو کوئی نہیں اٹھا۔ تیسری بار کہا تو بھی کوئی نہیں اٹھا۔ اس یک طرفہ شرائط والی صلح کو قرآن حکیم میں انا فتحنا لك فتحاً مبينا کہا گیا (ضرورت ہے کہ اسی انداز پر) بھارت کے ساتھ بھی ہماری کوئی مفاہمت ہو۔ بھارت کے ساتھ مصالحت سے اسلام کی تبلیغ کا بھی بہت بڑا موقع ہاتھ آئے گا جو اور کہیں نہیں ہے۔ اٹھارہ کروڑ مسلمان وہاں موجود ہیں، کچھ سہارا انہیں بھی ملے۔ کچھ آزادانہ

آمدورفت ہو۔ ہمارے پاس قرآن کی بہت بڑی طاقت موجود ہے، یہ عصائے موسیٰ سے بڑھ کر معجزہ ہے۔
(ماہنامہ میثاق، لاہور، مئی ۱۹۹۴، صفحہ ۲۱ - ۲۴)

دکتور مانع بن حماد الجہنی ۔ الامین العام للندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی، الریاض

دکتور مانع الجہنی نے دعوتی عمل میں غفلت کو ہندستانی مسلمانوں کے خلاف تشدد، نفرت اور تعصب کا بنیادی سبب قرار دیا۔ ریاض میں وامی کے ہیڈکوارٹر میں ۱۲ اپریل ۱۹۹۴ کو ہندستانی مسلمانوں کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے دکتور جہنی نے کہا کہ انھوں نے کئی بار ہندستان کا سفر کیا ہے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ مسلمان اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ مدتوں سے رہ رہے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں نے کبھی بھی اسلام کے پیغام کو اپنے غیر مسلم بھائیوں تک نہیں پہنچایا۔ اور نہ وہ اپنے اخلاق سے ان کو متاثر کر سکے۔ اسپین اور انڈیا کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دونوں ملکوں میں مسلمانوں نے ۸۰۰ سال سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ مگر وہ ان کو اسلامی ریاست میں تبدیل نہ کر سکے۔ دعوتی عمل کو پس پشت ڈالتے ہوئے انھوں نے اپنے آپ کو نام اور شہرت میں مشغول رکھا۔ ڈاکٹر جہنی نے مغل شہنشاہ شاہجہاں پر سخت تنقید کی کہ اس نے اپنی بیوی کی قبر پر ایک عظیم اور شاندار مقبرہ تعمیر کیا۔ اور اس پر بہت بڑی رقم مسرفانہ طور

DR. JOHANI URGES INDIAN MUSLIMS TO EXERT DAWAH WORK

Secretary-General of WAMY Dr. Manehi Al-Johani described the lapses in Dawah work as the main reason of violence, hatred and prejudice against Muslims in India.

· Addressing a gathering of Indian Muslims at WAMY's headquarters in Riyadh on April 12, 1994 Dr. Al-Johani said that he visited India several times and discovered that there were Muslims living with non-Muslims as their neighbors for decades, but, unfortunately, Muslims never conveyed the message of Islam to their non-Muslim brethren, nor could they impress them with their behavior.

Tracing the history of Spain and India, the Secretary-General said that in both countries Muslims ruled over 800 years, yet they could not convert them into Islamic states. Brushipg aside Dawah work, they indulged themselves in name and fame. He strongly flayed the Moghal Emperor, Shahjahan, for building a grand mausoleum on his wife's grave, spending a lot of money extravagantly, which could be used in Dawah work. If the Muslims had done so, India would have been altogether a different country. He urged Indian Muslims to preach Islam through their conduct and behavior and exert Dawah work as it is the only solution to their problems.

Monthly *Islamic Future*, Riyadh, No. 37, May 1994 p. 11.

پر خرچ کی۔ جب کہ یہ رقم دعوتی عمل پر خرچ کی جا سکتی تھی۔ اگر مسلمانوں نے ایسا کیا ہوتا تو انڈیا بالکل مختلف قسم کا ایک ملک ہوتا۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے اخلاق اور حسن سلوک کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ کریں اور پوری کوشش کے ساتھ دعوتی عمل کریں، کیوں کہ دعوت ہی ان کے مسائل کا واحد حل ہے۔ (ماہنامہ المستقبل الاسلامی، ریاض، ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ، صفحہ ۱۱)

ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ

آجکل مسلمانوں کا ہر اخبار اور ہر مجلہ مسلمانوں کو صبر و تحمل کی تلقین کر رہا ہے۔ ہر ایک یہ کہہ رہا ہے کہ مسلمان جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی کی پالیسی کو اپنی پالیسی بنائیں۔ یہاں مثال کے طور پر مجلس دار المصنفین اعظم گڈھ کے ماہوار علمی رسالہ "معارف" کے شذرات نقل کئے جا رہے ہیں:

"مسلمان اپنے مسائل کے حل کے لئے حکمت، تدبر اور دور اندیشی کے بجائے ان طریقوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں جن سے ان کے مسائل اور زیادہ الجھتے اور پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں، شور، ہنگامہ اور احتجاج کو انھوں نے اپنی طبیعت ثانیہ بنا لیا ہے، اس سے اس ملک میں ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، ہمیشہ سے کمزوروں اور مجبوروں کو تختۂ مشق بنانا اور ان پر ظلم و تشدد روا رکھنا زبردست اور جفا شعار لوگوں کا پیشہ رہا ہے، اس کے ازالے کے لئے گلہ، شکوہ اور جزع و فزع کبھی سود مند نہیں رہا ہے، ظلم و تشدد کا سدباب اسی وقت ہوتا ہے، جب مظلوموں اور زیردستوں میں قوت و طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنی کمزوری اور کمی کی تلافی کر کے اپنے حالات کی اصلاح کر لیتے ہیں، لیکن مسلمانوں نے نصف صدی کا طویل عرصہ بے عملی، تعطل، نالہ و شیون اور واویلا میں گزارا ہے۔ یہ بڑا المیہ ہے کہ دنیا کو آزادی، مساوات اور انصاف عطا کرنے والے آج ذلت، محکومی، ناانصافی اور تفریق و امتیاز کا شکار ہیں، جو ساری دنیا کے لئے چراغ راہ تھے وہ تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور انھیں راستہ نہیں مل رہا ہے۔ لوگوں کے مصائب و آلام کو دور کر کے انھیں سہولت و آسانی فراہم کرنے والے خود ایسے دلدل میں جا پھنسے ہیں جن سے نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔

شکست خوردہ قوموں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنی ہزیمت اور تباہی کا ذمہ دار دوسروں کو

سمجھتی ہیں اور خود اپنی غفلت و کوتاہی سے چشم پوشی کر لیتی ہیں، مسلمانوں کا حال بھی یہی ہے کہ وہ اپنی موجودہ زبوں حالی اور بربادی کا ذمہ دار دوسروں کو سمجھتے ہیں، اس لئے ان کے خلاف غصہ اور نفرت میں مبتلا رہتے ہیں اور انھیں اپنی غلطی اور بے تدبیری کا احساس نہیں ہوتا، اپنے باہمی اختلافات کو رفع کرنے کے بجائے ایک دوسرے کی کردارکشی ان کا وطیرہ بن گئی ہے، جس سے ان کے اختلاف و نزاع کی خلیج مزید بڑھتی جا رہی ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی ایک ہی یونیورسٹی ہے جو ان کا سب سے بڑا قومی سرمایہ ہے، لیکن گزشتہ کئی برس سے اس کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں، ان کو درست کرنے کے بجائے ہر فریق دوسرے کی ہوا خیزی، اسے نیچا دکھانے اور اس پر جا و بیجا الزام عائد کرنے میں لگا ہوا ہے اور خود اپنے طرز عمل کا محاسبہ کرنے کے لئے کوئی بھی آمادہ نہیں ہے۔" (ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، جولائی ۱۹۹۴، صفحہ ۲-۳)

فرقہ وارانہ نزاعات میں صبر و اعراض

صبر و تحمل کا یہ ذہن اب صرف خواص تک محدود نہیں ہے، وہ مسلم عوام تک بھی پہنچ چکا ہے۔ پچھلے برسوں میں سارے ملک میں سیکڑوں مقامات پر صرف اس لئے فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوئے کہ مسلمانوں نے اشتعال انگیزی کے باوجود صبر و اعراض سے کام لیا۔ اسی کی ایک مثال سہارن پور (یوپی) کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کی تفصیلی رپورٹ الجمعیۃ ویکلی، نئی دہلی (۲۴-۳۰ اپریل ۱۹۹۲) میں چھپی ہے، اس کا عنوان ہے: سہارن پور کے مسلمانوں نے پتھروں کا جواب صبر و ضبط سے دیکر فرقہ پرستوں کے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سہارنپور کے ہندوؤں نے مارچ ۱۹۹۱ میں رام نومی کا جلوس نکالا تھا۔ جامع مسجد کے پاس پہنچ کر انھوں نے اشتعال انگیز نعرے لگائے۔ مسلمان بھڑک گئے اور اس کے نتیجے میں خونیں فساد پیش آیا۔ اگلے سال ۱۱ اپریل ۱۹۹۲ کو پھر شہر میں رام نومی کا جلوس نکالا۔ سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت جامع مسجد پہنچ کر انھوں نے دوبارہ اشتعال انگیزی کی۔ مگر مسلمانوں نے اس بار مکمل اعراض کا طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ "فسادی پلان" کے باوجود فساد نہیں ہوا اور مسلمان کی جان و مال پوری طرح محفوظ رہی۔

جلسۂ میلاد النبیؐ، نئی دہلی

مذکورہ طرز فکر اب مسلمانوں میں عمومی طور پر پھیلتا جارہا ہے۔ ہر جلسہ اور ہر اجتماع میں اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ۲۱ اگست ۱۹۹۴ کو نئی دہلی میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں میلاد النبی کا ایک بڑا جلسہ ہوا۔ یہ روایتی انداز کا جلسہ تھا۔ اس میں قرأت، نعت، قوالی وغیرہ کے پروگرام ہوئے۔ کچھ تقریریں بھی ہوئیں۔ ایک تقریر مسز فرحانہ صدیقی (استاذ شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی تھی۔ انھوں نے سب سے زیادہ صبر و ضبط کے اصول پر زور دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات کی روشنی میں انھوں نے کہا کہ آپ طاقت رکھتے ہوئے بھی عفو و درگزر اور صبر و تحمل کے طریقہ پر عمل کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ثابت کیا ہے کہ اپنی بات پر اصرار نہ کرنا اور بظاہر دب کر معاملہ کرنا کمزوری کی علامت نہیں بلکہ یہ حکیمانہ تدبیر ہے جس سے نہایت اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

اس کی ایک مثال حدیبیہ کا معاملہ ہے۔ ۶ھ کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، چودہ سو اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا مقصد صرف زیارت کعبہ ہے۔ لیکن جب آپ مکہ کے قریب پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مکہ والے بھاری جمعیت کے ساتھ آپ کو روکنے کے لئے آرہے ہیں۔ آپ نے مناسب سمجھا کہ لڑنے کے بجائے صلح کا معاہدہ ہو جائے تو اچھا ہو۔ چنانچہ کچھ شرائط پر آپ مکہ والوں سے صلح کرکے مکہ میں داخل ہوئے بغیر واپس آگئے۔ یہ شرائط مکہ والوں کی موافقت میں تھیں۔ ان شرطوں کو قبول کرنا بظاہر دشمن کے مقابلہ میں ہار مان لینے کے مترادف تھا۔ مگر جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے، اس صلح سے اسلام اور مسلمانوں کو بے شمار فائدے پہنچے۔ سچ یہ ہے کہ کبھی دبنے سے بھی ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔ ہر حالت میں ایک ہی سا انداز نہ مفید ہے اور نہ مناسب۔

اگر ہم غور کریں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ آج ہمارے گرد و پیش بھی وہی حالات ہیں جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے تھے۔ آج بھی اسی قسم کے حوصلہ اور بلند نظری اور دور اندیشی کی ضرورت ہے۔ آج بھی اسی صبر و ضبط کی ضرورت ہے جس کی مثال زمانہ رسالت کے اسلام میں ملتی ہے۔ ایک دانے سے ہزار دانے پیدا ہوتے ہیں، بشرطیکہ اس میں اُگنے کی صلاحیت موجود ہو۔ (اصل سے ماخوذ)

مکتوب حیدر آباد

مکرمی و محترمی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط جس میں آپ نے لکھا تھا کہ بعض حلقوں میں آپ کی شخصیت کو متنازعہ سمجھا جاتا ہے بہت روز سے میرے سامنے میز پر رکھا ہے۔ روز سوچتا ہوں کہ اس سلسلہ میں کچھ لکھوں۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔ اس لئے کہ آپ نے ہی خود اپنے خط میں مثالوں کے ذریعہ کئے گئے اعتراضات کی معقول وضاحت کردی۔ آپ کے خط کے ہر جملہ سے سوچ وفکر اور خیالات کی پاکیزگی نظر آرہی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ میں بھی کچھ اپنے تاثرات کا اظہار کردوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ شخصیتوں کو متنازعہ قرار دینا دنیا کا بہت ہی پرانا دستور ہے۔ ہر وہ شخصیت جس کے نظریات عوام کی سمجھ سے باہر ہوں ہمیشہ متنازعہ بنی رہتی ہے اور جب ان نظریات کی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے تو یہی عوام ان کو ہیرو بناکر پرستار ہوجاتے ہیں۔

ابن رشد کے نظریات نے اس کی شخصیت کو متنازعہ بنادیا تھا۔ اس کو اپنی جان بچانے کے لئے مراکش میں دربدر مارا مارا پھرنا پڑتا تھا۔ مگر آج اس کو موجودہ سائنس کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ کیپلر، کوپرنکس اور گلیلیو عیسائی دنیا کی متنازعہ شخصیتیں تھیں۔ اس لئے کہ ان کے فلکیاتی نظریات بائبل کے خلاف تھے مگر آج ان کے نظریات کو تسلیم کرنا پڑا۔ الکندی کے نظریات کو مذہب اسلام کے خلاف سمجھا جانے لگا۔ مگر آج اس کو کیمسٹری کا استاد مانا جاتا ہے۔ زمانۂ وسطیٰ میں بہت سے حکماء و فلاسفہ اپنے ہم عصر لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کے لئے، تاکہ ان کی شخصیتیں متنازعہ نہ بن جائیں وہ اپنی تحقیقات و نظریات کو ارسطو سے وابستہ کرتے رہے۔ جس کے نتیجہ میں ارسطو کو غیر معمولی شہرت مل گئی اور اس کو معلم اول قرار دیا گیا۔ جب سرسید احمد خاں کو "انگریزوں کا پٹھو" کہا گیا تو ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ مگر وہ استقلال سے اپنے مشن کو چلاتے رہے۔ قوم انگریزی پڑھنے لگی اور علمی دوڑ میں دوسرے کے ساتھ سر اٹھائے چل رہی ہے۔ ایسے ہی الزامات جیسا کہ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے بہت سے لوگوں پر لگائے گئے مگر وہ اپنے مشن کو پورا کرتے رہے۔ یہ الزام لگانے والے خود تو کچھ نہیں کرسکتے مگر دوسروں کو کرنے بھی نہیں دیتے بلکہ راستہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔

آپ کا نظریہ ہندو مسلم اتحاد کا نہ صرف وقت کا تقاضا ہے بلکہ بے انتہا ضروری ہے۔ ہم جہاں رہتے ہیں ہم کو ہر قدم پر غیر مسلم اصحاب سے سابقہ پڑتا ہے ان سے مل جل کر رہنے میں نہ صرف ہماری بلکہ ساری قوم کی بھلائی ہے۔ تاریخ سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قوموں کا اتحاد ملک و قوم کے عروج کا سبب بنا۔ اور اب بھی اس اتحادی نظریہ کو اپنا کر دنیا کی مختلف قومیں ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔

میرا جہاں تک خیال ہے کہ دو طرفہ بنیادوں پر یک جہتی کی مثالیں بہت کم ہیں۔ یہ مسئلہ ہمیشہ دو لیڈروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے جہاں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ طریقہ بہت کم کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ مگر یکطرفہ طریقہ ہمیشہ کامیاب ہوا۔ اس میں ٹکراؤ اور برتری کی پالیسی نہیں ہوتی۔ سنجیدگی، محبت اور خلوص کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

ہمارے بزرگوں کی تاریخ اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ انھوں نے اسی یکطرفہ طریقہ کو اپنایا تھا اور اسی طریقہ سے نہ صرف اپنی قوم بلکہ غیر اقوام کا بھی دل جیت لیا۔ ان سے ملنے والوں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کا مجموعہ رہتا تھا۔ لوگ ان کو نہ صرف زندگی ہی میں چاہنے لگے تھے بلکہ آج صدیوں بعد بھی ان کے مزاروں پر ہندو مسلم عوام اکٹھے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ ان بزرگوں کے مریدوں نے کرامات پر اتنا زور دیا کہ ان کی اصلی تعلیم کو ہی نظر انداز کر دیا۔

آپ کے یکطرفہ طریقہ کے مشورہ کو اپنا لیا جائے تو بہت سے اختلافات دور ہو سکتے ہیں۔ قومیں مل جل کر ترقی کر سکتی ہیں اور ملک کی ترقی کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ ورنہ آپسی جھگڑے ملک کو کمزور کرتے ہیں بلکہ بہت کچھ کر چکے ہیں۔

یک طرفہ طریقہ کی کامیابی کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ اخلاقی قوت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر مسلمان قرآن اور حدیث کی روشنی میں اپنے اخلاق کو درست کر لیں تو کوئی جھگڑا ہی نہ کھڑا ہوگا۔ قرآنی اخلاق انسان کو انسان بناتے ہیں۔ سیاسی اخلاق انسان کو فساد کے میدان میں اتارتے ہیں۔ اگر ہم قرآنی اخلاق پر عمل پیرا ہو جائیں تو کوئی بھی ہماری طرف انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ یہ تاثر سب کے دماغ میں آجائے گا کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولتے۔ چوری نہیں کرتے۔ فتنہ پرور نہیں ہوتے، دیانت دار، امانت دار اور انصاف پسند ہوتے ہیں۔ اگر محلہ میں کہیں چوری ہو جائے اور اس کا الزام کسی مسلمان پر آجائے تو پولیس یہ کہے بنا نہ رہے کہ مسلمان سے یہ غلطی نہیں ہو سکتی۔ دفتروں میں یہ تاثر بن جائے

کہ مسلمان رشوت نہیں لیتے۔ ناجائز آمدنی کی طرف رخ نہیں کرتے۔ دکاندار پر غلط دکانداری کا الزام نہ لگ سکے۔ مگر ہمارے پاس قرآنی اخلاق نہیں ہیں۔ ہم نے سیاسی اخلاق کو اپنا لیا ہے۔ پارٹی بازی ہمارا شیوہ ہوگیا ہے۔ ہم پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں روزے رکھتے ہیں مگر ہمارے اخلاق سے کوئی متاثر نہیں ہوتا۔

اصل بات تو یہ ہے کہ ہمارے پاس قیادت کا بھی مکمل فقدان ہے۔ خود ساختہ لیڈروں کا الگ الگ نظریہ ہے۔ ہمارے لیڈر سیاسی شہرت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور مذہبی رہنما مختلف نظریات کی دعوت دیتے ہیں اور سب ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہوسکتے اللہ کے پاس جوابدہی کا بہت کم خیال رکھتے ہیں۔ عوام بھی ان لیڈروں کے پیچھے بھاگتے ہیں جو طیش دلانے والی بات کریں، ٹکراؤ کی پالیسی کو اختیار کریں اور کوئی بھی جو سنجیدگی صلح و آشتی کی طرف رہنمائی کرے اس کو بزدل اور بکاؤ سمجھتے ہیں اور اس کی شخصیت کو متنازعہ قرار دیتے ہیں۔

یہ فرقہ واریت جس سے ہم کو سابقہ پڑ رہا ہے ایک سیاسی کھیل ہے۔ اس میں اصول اور اخلاق کا کوئی دخل نہیں۔ قتل غارتگری لوٹ مار سب جائز ہیں۔ مگر اس کا عام زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک ہی محلہ میں سب مل کر رہتے ہیں، اسکولوں میں بچے مل جل کر پڑھتے ہیں۔ دفتروں اور کارخانوں میں ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔ ہندو ڈاکٹر یا وکیل پر مسلمان اعتماد کرتے ہیں اور مسلمان ڈاکٹر یا وکیل پر ہندو۔ ہندوؤں کے پاس مسلمان نوکر ہیں اور مسلمانوں کے پاس ہندو۔ کاروبار میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ خرید و فروخت ایک دوسرے سے ہوتی ہے اور سب خوش و خرم ملک کی ترقی میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

میری ساٹھ سالہ زندگی میں مجھے فرقہ واریت کہیں نہیں ملی۔ دفتر میں، بزنس میں، میرے پیشہ وکالت میں، چوں کہ ان پیشوں سے میں یکے بعد دیگرے وابستہ رہا ہوں۔ ہر پیشہ میں مجھے غیر مسلم اصحاب سے ہمت افزائی ہوتی رہی۔ ان سب ہمت افزائیوں کی تفصیل چوں کہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ طوالت کے خوف سے لکھنا نہیں چاہتا مگر چند واقعہ یہاں درج کر رہا ہوں۔

میرے والد صاحب جلال آباد شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے اور بچپن ہی سے اپنا وطن چھوڑ کر حیدرآباد چلے آئے۔ ایک مرتبہ جب میں دہلی جا رہا تھا مجھ سے جلال آباد چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں،

میری شریک حیات اور ایک کمسن لڑکے کولے کر ان کے ساتھ شاہجہاں پور پہنچا۔ وہاں سے جلال آباد جانے کے لئے ٹیکسی کرنی پڑتی تھی چنانچہ میں نے ٹیکسی لے لی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد والد صاحب نے کہا کہ راستہ میں ایک گاؤں منڈیا پڑتا ہے وہاں میرا ایک خالہ زاد بھائی نبی حسن رہتا تھا اس سے مل لیں گے چنانچہ ٹیکسی کا رخ ادھر کر دیا گیا۔ جیسے ہی ٹیکسی ٹھہری دس بارہ لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ ان سے نبی حسن کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پاکستان چلا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی میرا دماغ چکرا گیا۔ میرے دماغ میں اخبارات کی سرخیاں گھومنے لگیں۔ جن سنگھ۔ پاکستانی مسلمان۔ فرقہ واریت۔ ہندو مسلم فسادات وغیرہ۔ میں کچھ دیر سکتے میں رہا۔ اس کے بعد میں نے ڈرائیور سے کہا کہ چلو ہم جلال آباد جائیں گے۔ مجمع میں سے ایک شخص نے کہا، کیا آپ جا رہے ہیں۔ نبی حسن نہیں رہا تو کیا ہوا ہم لوگ جو ہیں آپ ایسے نہیں جا سکتے۔ جلپان وغیرہ کر کے جائیں۔ ماحول کے لحاظ سے مجھے ان کی باتوں میں شبہ سا نظر آنے لگا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں جلدی میں ہوں مجھے جانے دیجئے۔ اب تو سب لوگ ایک آواز میں بول اٹھے کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ میں اصرار کرتا رہا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے جب تک آپ مکھیا سے اجازت نہ لیں۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے میں ایک آواز آئی کہ مکھیا جی خود آرہے ہیں۔ وہ جب آئے تو مجمع کی بات سنی اور بولے یہ ناممکن ہے کہ آپ نبی حسن کے لئے آئیں اور ہم آپ کو جانے دیں۔ وہ ہمارے گاؤں کا رہنے والا تھا اور آپ اس کے عزیز ہیں۔ آپ یہاں رکیں اور بھوجن کر لیں۔ میں نے ان سے بہت عاجزی کی تو انھوں نے کہا کہ کم سے کم آپ جل پی کے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے فوری جل لانے کے لئے کہا۔ چنانچہ کچھ ہی دیر میں ایک مٹی کی ٹھلیا میں مصری سونف ملا ہوا پانی آگیا۔ وہ پانی پی کر ہم ان کا شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ اور میں راستہ بھر سوچنے لگا کہ جن سنگھی کہاں ہیں۔ مسلم پارٹیاں کہاں ہیں۔ وہ فرقہ واریت اور فسادات کے بانی کہاں ہیں۔ وہ اخبارات کہاں ہیں جن میں فرقہ واریت کی سرخیاں لگتی تھیں وہ سب مجھ کو کورا کاغذ نظر آنے لگیں۔

ہماری ٹیکسی جلال آباد پہنچی دریافت کرنے پر والد صاحب کا آبائی مکان ملا جو ایک حویلی نما تھا۔ بوڑھے لوگوں نے بتایا کہ وہاں کبھی ہاتھی جھومتے تھے۔ خیر ہماری کسی رشتہ دار سے ملاقات نہ ہو سکی ہم واپسی کا خیال کرنے لگے۔ شام ہو رہی تھی۔ اتفاقاً اُس ٹیکسی کا مالک جلال آباد کا رہنے والا تھا۔ وہ ہندو تھا۔ پیشانی پر ایک بڑا سرخ تلک لگا ہوا تھا۔ وہ ہمارے قریب آیا اور بولا آپ

واپس جارہے ہیں ؟ آپ کے رشتہ دار نہیں ملے ؟ یہاں کے سب لوگ شہروں کو منتقل ہوگئے وہ میری طرف دیکھ کر بولا آپ شام کا بھوجن ہمارے ساتھ کر کے چلے گئے چلے جائیں۔ میں نے کہا کہ بھوجن تو کہا ہو جائے گا مگر مجھے جلدی شاہجہاں پور پہنچنا ہے کہ کہیں دہلی کی ٹرین چھوٹ نہ جائے۔ خیر انکار اور اصرار اس کی جیت ہوگئی۔ مجھے اس کے پاس بھوجن کرنا ہی پڑا۔ کھانے کے دوران اس نے کہا کہ آپ ہم شاہجہاں پور کے غازی آباد چلے جائیں وہاں سے کئی ٹرین دہلی کے لئے چلتی ہیں آپ آرام سے پہنچ جائیں گے۔ آپ کے ساتھ بہن جی چھوٹا کا اور بابا صاحب بھی تو ہیں ان کو کوئی تکلیف بھی نہ ہوگی شدید سردی پڑ رہی ہے۔ غازی آباد شاہجہاں پور سے کافی دور تھا۔ میں نے کہا کہ ٹیکسی کا کرایہ بہ جائے گا۔ شاہجہاں پور ہی میرے لئے مناسب ہے۔ اس نے کہا آپ خرچہ کی کیوں سوچتے ہیں یہ ڈرائیور آپ کو چھوڑ دے گا آپ اسے کچھ نہ دیں۔ مگر میں نے اس کی منت سماجت کر کے شاہ پور چھوڑنے پر راضی کر لیا۔ یہ واقعات گویا ایک طمانچہ ہیں ان لوگوں کے منہ پر جو فرقہ واریت کی گھولتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں کناٹ پلیس سے دہلی ایئر پورٹ کی طرف جارہا تھا۔ ٹیکسی ایک روڈ پر سے گزر رہی جس پر ٹرافک کم تھی۔ ڈرائیور نے کہا آپ برا نہ مانیں تو مجھے ایک کام کرنے کی اجازت دیجئے۔ نے سمجھا شاید وہ سگریٹ پینا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کوئی برا کام نہیں ہے تو کر لو اس نے ٹیکسی سڑک کے کنارے روک دیا۔ اور اسٹیرنگ کے نیچے کے خانہ سے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی جس میں شراب تھی۔ میں نے کہا یہ تو غلط کام ہے۔ اگر تم کو پینا ہو تو پی لو میں یہاں اتر کر دوسری ٹیکسی کر لوں گا۔ وہ بو آپ ناراض ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا اس میں ناراضی کی کون سی بات ہے۔ پینا تمہاری مرضی ا دوسری ٹیکسی لینا میری مرضی۔ نہیں بابو جی آپ ناراض ہو گئے۔ میں نہیں پیوں گا۔ اس نے بوتل اندر رکھدی۔ اور خاموش کچھ سوچتا ہوا گاڑی چلانے لگا۔ میں جب اپنے مقام پر پہنچا تو بو بابو جی کب لوٹو گے۔ میں نے کہا میں نہیں بتا سکتا — ایک گھنٹہ کے بعد جب میں واپس آیا تو وہ انتظار کر رہا تھا۔ میں بادلِ ناخواستہ اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستہ میں اس نے اپنا ہندو بتایا اور مجھ سے پوچھا آپ کیا کام کرتے ہیں۔ میں نے کہا میں وکیل ہوں۔ حیدرآباد کا رہنے والا ہوں۔ سپریم کورٹ آیا ہوں۔ وہ ہوٹل کے کمرہ تک میرے ساتھ آیا۔ دوسرے روز جب

سپریم کورٹ جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا وہ موجود ہوگیا۔ دو بجے جب میں باہر نکلا تو وہ کھڑا تھا میرے دماغ میں اس کے تعلق سے کئی خیالات آنے لگے۔ غنڈہ، چور، لٹیرا۔ اس کی بھاری بھرکم شخصیت بھی اس کا ثبوت دے رہی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بولا۔ بابوجی میرا مکان راستہ میں پڑتا ہے آپ ڈومنٹ کے لئے میرے گھر پدھاریں تو میرا پریوار خوش ہوجائے گا۔ اس کے اس جملہ میں عاجزی، انکساری اور خلوص نمایاں تھا۔ میں وقتی طور پر کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔ ہاں کہہ دیا۔ گھر پہنچنے کے بعد اس نے اپنی ماں اور بیوی سے ملایا اس کا ایک چھوٹا سا لڑکا بھی تھا۔ اس کی والدہ نے چائے پینے کے لئے کہا اور اس کی بیوی فوراً باورچی خانہ میں چلی گئی۔ ایک تھالی میں روٹی لائی اور بولی یہ مولی کی روٹی ہے۔ ان کے خلوص کے سامنے زہر بھی امرت میں بدل سکتا تھا۔ میں نے مولی کی روٹی اس سے قبل نہیں کھائی تھی۔ کچھ روٹی کھالیا جو مجھے بہت پسند آئی۔ میں ان سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ وہ مجھے دوسرے روز ایئر پورٹ چھوڑنے آیا۔ ہاتھ میں پیتل کا توشہ دان تھا۔ وہ بولا بابوجی ان میں مولی کی روٹیاں ہیں گھر لے جائیے۔ میرے انکار کے باوجود بڑے خلوص سے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے جب ٹیکسی کا کرایہ اسے دینے کے لئے پاکٹ کھولا تو اس نے کہا بابوجی اس کی ضرورت نہیں.... میں نے اس کے خلوص اور محبت کو پیسوں میں تولنا نہیں چاہا، میں خاموش ہوگیا۔ اس سے رخصت ہو کر ایئر پورٹ کے اندر چلا گیا۔ دو ماہ بعد جب میں دہلی گیا تو اس کا توشہ دان واپس کرنے کے لئے کئی تحفہ تحائف لے کر اس کے مکان گیا۔ وہ نہیں تھا مگر اس کی بیوی اور ماں گھر میں تھے۔ اس کی ماں نے مجھے دیکھتے ہی اندر آنے کے لئے کہا اور بولی "بیٹا آپ نے کیا جادو کر دیا کہ میرے لڑکے نے آپ سے ملنے کے بعد شراب پینا چھوڑ دیا ہے۔"

جین دھرم کے ماننے والے ایک صاحب میرے دوست تھے۔ ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے اور لڑکیاں مجھ کو اپنا دھرم باپ مانتے ہیں۔ مجھے اتنا ہی محبت اور عزت دیتے ہیں جیسے باپ کو۔ اس تحریر سے دو ہفتہ قبل میرے ایک عزیز کا انتقال ہوا۔ تدفین کے وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کا کثیر مجمع تھا۔ محلہ کے ہندوؤں نے احتراماً اپنی دکانیں بند کر دی تھیں۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ فرقہ واریت کا کہیں وجود نہیں ہے۔ اکثر اخبار وں میں یہ خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ جب کسی مقام پر فساد ہوتا ہے تو محلہ والے ایک دوسرے کو پناہ دیتے ہیں

جان ومال اور عزت وناموس کی حفاظت کرتے ہیں ایسے ہی اگر فرقہ واریت دواخانوں میں ہوتی تو کئی مریض آپریشن کے ٹیبل پر یا بستروں پر لاپرواہی سے مرجاتے۔ کوئی ایک دوسرے کو خون نہیں دیتا یا گردے تبدیل نہیں ہوتے۔ یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر سڑک پر کوئی حادثہ ہوجائے تو مدد کرنے والے ہندو کو دیکھتے ہیں نہ مسلمان کو بلکہ بے تحاشہ مدد کو دوڑ پڑتے ہیں۔ ایسے واقعات فرقہ پرستی کی تضحیک کرتے ہیں۔

طیش دلانے والی تقریریں اور ٹکراؤ کی پالیسیوں نے جن کا ہم طویل عرصہ سے مشاہدہ کر چکے ہیں، سوائے مالی اور جانی نقصان کے ہم کو کچھ نہیں دیا۔ بہتر ہے کہ ہم خاموش اور صبر وتحمل سے رہیں جیسا کہ آپ نے اپنے مضامین اور کتابوں میں کافی روشنی ڈالی ہے اور آجکل ایسے ہی بیانات بعض اصحاب کے اخباروں میں پڑھنے کو مل رہے ہیں — اور ساتھ ساتھ قرآنی اخلاق اور آنحضرت کے طریقہ کو اپنالیں تو یہ طریقے یکطرفہ بنیادوں پر یکجہتی کو کامیاب بنادیں گے جس سے نہ صرف فائدہ مسلمانوں کو ہی ہوگا بلکہ ملک بھی ترقی کرے گا۔ ملک کی ترقی کے لئے بھائی چارگی اور فراخدلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہم یکطرفہ بنیادوں پر یہ کام اپنے ذمہ لے لیں تو ملک کی تعمیر وترقی میں ہمارا بہت بڑا حصہ ہوگا۔ تنگ نظری، تعصب اور فرقہ پرستی کا جس سے ہم کو سابقہ پڑ رہا ہے خود بخود خاتمہ ہوجائے گا۔

(۱۹ جولائی ۱۹۹۴)

ڈاکٹر عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ، سکندرآباد (حیدرآباد)

Dr Aziz Ahmad Khan, Advocate,
11-1-777, Chilkalguda, Secunderabad 500361
Tel. 865718

Forthcoming publications

1. Woman in Islam and Western Society; 320 pages.
2. Islam: The Creator of Modern Age; 120 pages.
3. Islam: The Voice of Human Nature; 64 pages.
4. Hijab in Islam; 16 pages.

ہندستان ٹائمس کی نمائندہ کم کم چڈھا نے ۴ مئی ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق مسلم مسائل اور ملکی حالات سے تھا۔ وہ ایوننگ نیوز ۷ مئی ۱۹۹۴ میں چھپا ہے۔

"ہفتۂ ملاقات" کا ایک خصوصی منصوبہ زیر غور ہے۔ اس کے مطابق صدر اسلامی مرکز سفر کر کے ملک کے مختلف مقامات پر جائیں گے اور ایک ایک ہفتہ کے لئے قیام کریں گے۔ اس دوران مقامی افراد کو جوڑ کر یہ کوشش کی جائے گی کہ ان میں دینی طرز فکر پیدا ہو اور وہ حالات حاضرہ کا مطالعہ اسلام کی روشنی میں کر سکیں۔ ملاقات کے اس پروگرام کے سلسلہ میں مقامی لوگوں پر اخراجات کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ جن مقامات کے لوگ اپنے یہاں "ہفتۂ ملاقات" کا یہ پروگرام رکھنے کے خواہش مند ہوں وہ بذریعہ ڈاک مطلع فرمائیں تاکہ اس کا نظام مرتب کرتے ہوئے ان کا نام اس میں شامل کیا جا سکے۔

نلنی سنگھ اسوسی ایٹ (Nalini Singh Associates) نے ۵ مئی کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ویڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کیا جو ٹی وی پر دکھایا جائے گا۔ سوالات کا تعلق اس بات سے تھا کہ ہندستان میں عدم رواداری (ان ٹالرنس) بڑھ رہی ہے۔ بتایا گیا کہ عدم رواداری انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے اس کا اظہار ہمیشہ وقتی ہوتا ہے۔ وہ کبھی مستقل طور پر نہیں بڑھتی۔

اچاریہ منی سوشیل کمار کے انتقال پر ۲ مئی ۱۹۹۴ کو اہنسا بھون (نئی دہلی) میں ایک سوگ سبھا ہوئی۔ اس میں دوارکا پیٹھ کے شنکر اچاریہ بھی شریک تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ انھوں نے بتایا کہ اچاریہ جی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۵ میں ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً ۳۰ سال کے دوران بار بار ملاقات ہوئی۔ انھیں کے ساتھ مل کر دسمبر ۱۹۹۲ میں شانتی یاترا نکالی گئی۔ اس کی رپورٹ ٹائمس آف انڈیا ۹ مئی ۱۹۹۴ میں چھپی ہے۔

میڈیا اسٹار کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر نسیم نقوی نے ۱۰ مئی ۱۹۹۴ کو صدر سلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق شریعت اسلامی کے کچھ مسائل

سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلم پرسنل لابورڈ نے یکم مئی کے اجلاس میں یہ صحیح فیصلہ کیا ہے کہ جسٹس تلہری کے معاملہ پر ایجی ٹیشن کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ مگر اسی کے ساتھ انھیں یہ اعلان بھی کرنا چاہئے کہ اس سے پہلے شاہ بانو بیگم اور بابری مسجد وغیرہ مسائل پر عوامی احتجاج کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ غلط تھا۔ عوام کو رہنمائی دینے کے لئے یہ اعتراف بھی ضروری ہے۔

۶ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی (نیشنل چینل) سے ۳۱ مئی ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: اسلامی تعلیمات کا انسانی پہلو۔ اس تقریر میں خاص طور پر ان العباد کلهم اخوة کی تشریح کی گئی۔

۷ دور درشن کی ٹیم نیوز واچ (Newswatch) نے ۲۲ مئی ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر دہلی کے سلاٹر ہاؤس کے مسئلہ سے تھا۔ بتایا گیا کہ اس معاملہ میں متوازن فیصلہ لیا جانا چاہئے۔ کیوں کہ سلاٹر ہاؤس کا تعلق اگر ماحولیات کے مسئلہ سے ہے تو دوسری طرف گوشت اور دوسری متعلق چیزوں کے اکسپورٹ سے قیمتی زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ کسی ایک فرقہ کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے (یہ اسٹرائک ۲۳ مارچ ۱۹۹۴ کو شروع ہوئی اور ۱۶ جون ۹۴ کو ختم ہو گئی)

۸ راشٹریہ آریہ مہاسمیلن ۲۸-۲۹ مئی ۱۹۹۴ کو نئی دہلی (تال کٹورہ اسٹیڈیم) میں ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ۲۸ مئی کے اجلاس میں شرکت کی اور ذات پات اور علاحدگی پسندی کے مسئلہ پر اصلاحی نقطۂ نظر پیش کیا۔

۹ دہلی (ایوان غالب) میں ۵ جون ۱۹۹۴ کو کل ہند علماء اہل حدیث کانفرنس منعقد ہوئی اس کا موضوع حالات حاضرہ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کی۔ یہ بات نوٹ کی گئی کہ جمعیۃ اہل حدیث سمیت تمام مسلم تنظیمیں اب اسی نہج پر آرہی ہیں جس کی طرف دعوت الرسالہ میں ۱۹۷۶ میں شروع کی گئی تھی۔ چنانچہ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ نے اپنے مطبوعہ خیر مقدمی کلمات میں مروجہ مناظرہ کا طریقہ چھوڑنے کی تلقین کی۔ انھوں نے کہا: داعی اپنے مدعو کا ہمدرد اور سچا بہی خواہ ہو۔ ان سے اسے

وابہانہ وابستگی اور شفقت ومحبت ہو جب کہیں جا کر مدعو کے دل میں داعی جگہ بناتا ہے۔ عصر حاضر کا مزاج جدال اور مناظرہ کا متحمل نہیں ہے۔

۱۰ انگریزی اخبار پانیر کے نمائندہ مسٹر اعجاز اشرف نے ۶ جون ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ کیا اسلام میں زمانہ کے لحاظ سے نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس نقطہ نظر کی سختی کے ساتھ تردید کی گئی اور دلیل سے بتایا گیا کہ اسلام ایک ابدی صداقت ہے، اس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

۱۱ اکنامک ٹائمس کے نمائندہ مسٹر بابر زیدی نے ۹ جون ۱۹۹۴ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ مسلمانوں کو سائنسی تعلیم کے میدان میں کس طرح لایا جائے۔ بتایا گیا کہ یہ کام فتوی کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے لوگوں کو ایجوکیٹ کرنا پڑے گا۔

۱۲ سنتوش کمار پانڈے اور مسٹر محمد یتیم کمالی نے ۱۰ جون ۱۹۹۴ کو آل انڈیا ریڈیو کے لئے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس بات سے تھا کہ تسلیمہ نسرین جیسے واقعات کیا یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام میں ریفارم کی ضرورت ہے۔ بتایا گیا کہ ریفارم کی ضرورت مسلمانوں میں ہے نہ کہ اسلام میں۔

۱۳ ایشین ایج کی نمائندہ مسز شیلا ریڈی نے ۱۲ جون ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا ٹیلی فون پر انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس بات سے تھا کہ ہندستان میں مسجدوں اور مدرسوں کا انتظام کیا ہے اور کس طرح اسے چلایا جاتا ہے۔

۱۴ ہندی روزنامہ جن ستا کے نمائندہ مسٹر اسرار احمد نے ۱۳ جون ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویور نے اسلام سے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ کیا اسلام میں سدھار کی ضرورت ہے۔ جواب دیا گیا کہ اسلام میں سدھار کا کوئی سوال نہیں۔ البتہ مسلمانوں میں بہت سے بگاڑ آگئے ہیں اور ان میں ضرور سدھار کی ضرورت ہے۔

۱۵ الرسالہ کا ایک خصوصی نمبر زیر تیاری ہے۔ یہ اسلام کی اخلاقی اور انسانی تعلیمات پر مشتمل ہوگا۔ اس کا نام اخلاقیات ہوگا۔

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is in the very nature of things. But repeated emphasis on the darker side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead only to discouragement, depression and inertia. The better way to find solutions to the problems besetting us would be to seek out and lay stress on whatever opportunities present themselves, so that those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on how, in entering upon the more positive avenues open to them, Muslims may avail themselves of the same kind of opportunities right here in India as they would find at any other point on the globe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London